جلد (۸) عدد (۶)
جمادی الاخریٰ ۱۳۵۵ھ

رجسٹر نمبر مصفیہ ۱۲۰
رجسٹر نمبر ایم ۲۹۵

۷۸۶

ماہنامہ

# ترجمان القرآن

علوم قرآنی وحقائق فرقانی کا ذخیرہ

مرتبہ

سید ابوالاعلیٰ مودودی

قیمت سالانہ (صہ)
قیمت فی پرچہ ۸ر

# فہرست مضامین

جمادی الاخریٰ ۱۳۵۵ھ جلد (۸) عدد (۶)

بسم اللہ الرحمن الرحیم

# اشارات

ناظرین کو یاد ہو گا کہ ذی الحجہ ۵۴ھ کی اشاعت میری بیماری کی وجہ سے ملتوی کرنی پڑی تھی۔ اس طرح جلد ہفتم میں ۸۰ صفحات کی جو کمی ہو گئی تھی اسکو جلد ہشتم کے پانچ پرچوں میں سولہ سولہ صفحات کا اضافہ کر کے پورا کر دیا گیا۔ اب اس مہینے سے ترجمان القرآن حسب معمول ۸۰ صفحات پر شائع ہوگا

---

یہ رسالہ ابتدائی دو ڈھائی سال تک نہایت باقاعدگی کے ساتھ وقت پر شائع ہوتا رہا۔ مگر اب تقریباً ایک سال سے وہ باقاعدگی اور پابندیٔ وقت باقی نہیں رہی بعض مہینوں میں تو اس قدر تاخیر ہو جاتی ہے کہ ناظرین کو شکایت کا موقع مل جاتا ہے مجھے اس صورت حال پر افسوس ہے۔ کوشش کر رہا ہوں کہ حالات کی اصلاح ہو جائے۔ مگر شاید ابھی چند مہینوں تک اور یہی کیفیت رہے گی، اس لیے ناظرین سے درخواست ہے کہ ہر مہینے کی اشاعت کا انتظار دوسرے مہینہ کے پہلے ہفتہ تک فرمائیں۔ اسی لحاظ سے قواعد میں بھی ترمیم کر دی گئی ہے۔

---

پچھلے دنوں جناب مولانا عبدالماجد صاحب دریابادی نے ایک پرائیویٹ خط سے ترجمان القرآن کے مالی حالات معلوم کر کے از راہ ہمدردی اپنے اخبار "صدق" میں اس کا تذکرہ فرما دیا تھا۔ اسکو دیکھ کر لاہور کے اخبار "ٹروتھ"۔ اور دہلی کے جریدۂ "الجمیعۃ" نے بھی چند کلمات خیر اس رسالہ اور اس کے اڈیٹر کے حق میں لکھ دیے ہیں اس ہمدردی اور خلوص و محبت کا دلی شکریہ ان سب حضرات کی خدمت میں عرض

کرتا ہوں انہوں نے جو ہمدردی کی حسبۃً للہ کی، اور اللہ ہی اس کا اجر دینے والا ہے۔

"ترجمان القرآن" دراصل میری زندگی کا مشن ہے۔ میں نے جس کام کو اپنا مقصدِ حیات قرار دیا ہے اُسی کو انجام دینے کے لیے اس پرچہ کو چلا رہا ہوں۔ اب تک اس کام میں جو کچھ بھی مشکلات پیش آئیں ان کا حال بجز میرے مخصوص دوستوں کے، کسی اور کو معلوم نہ تھا، کیونکہ رسالہ کا حال گویا میرا ذاتی حال ہے اور پبلک میں اسکا اظہار میں نے کبھی مناسب نہیں سمجھا لیکن اب "صدق" اور "ٹروتھ" "الجمعیۃ" میں اتفاقاً ان کے شائع ہو جانے کی وجہ سے بہت سے ان حضرات تک یہ حالات پہنچ گئے ہیں جو "ترجمان القرآن" کو قدر کی نگاہ سے دیکھتے ہیں، اور متعدد اصحاب نے اپنے خطوط میں تشویش کا اظہار فرمایا ہے، اس لیے آج مجبوراً احوال واقعی کا اظہار کرتا ہوں۔

ترجمان القرآن کی اشاعت اس وقت صرف چھ سو ہے۔ دوسری قوموں کے علمی ذوق اور جرائد کی اشاعت کو دیکھتے ہوئے تو یہ تعداد بہت کم ہے مگر مسلمانوں کی ذہنی حالت کے لحاظ سے اس کو بہت زیادہ سمجھنا چاہیے کیونکہ ان کی دلچسپیوں کا دائرہ دوسرا ہے۔ اس چھ سو کی تعداد میں سے پورے نصف کی خریدار سرکارِ آصفیہ ہے۔ اگر ان تین سو پرچوں کو الگ کر دیا جائے تو یہ کہا جا سکتا ہے کہ کروڑوں مسلمانوں کی اس آبادی میں صرف تین سو اصحاب ایسے ہیں جو "ترجمان القرآن" کی وضع کا ایک رسالہ پڑھنے کے لیے کچھ خرچ کر سکتے ہیں۔ پھر ان تین سو میں سے بھی دس فی صدی حضرات اپنے بجٹ میں اس رسالہ کی پوری قیمت کے لیے گنجائش نہیں نکال سکتے، مگر چونکہ ہم خود ان تک اپنی آواز پہنچانے کے غرض مند ہیں، اس لیے ہم کو مجبوراً رعایتی قیمت بلکہ بسا اوقات برائے نام قیمت پر ان کے نام پرچہ جاری کرنا پڑتا ہے۔

ظاہر ہے کہ اس معیار کا کوئی پرچہ اتنی کم اشاعت پر زندہ نہیں رہ سکتا۔ حیدرآباد میں کتابت طباعت اور کاغذ تینوں چیزیں ہندوستان کے دوسرے مراکز اشاعت کی بہ نسبت سوائی اور ڈیوڑھی گراں ہیں۔ اس وجہ سے پرچہ کی آمدنی اسکی ضروریات کے لیے اور بھی زیادہ غیر مکتفی ہو گئی ہے۔ پھر اس آمدنی میں اتنی گنجائش کہاں کہ وہ ایک اعلیٰ درجہ کے علمی رسالہ کی وہ ضروریات فراہم کر سکے جو طباعت کے مصارف سے بالاتر ہیں۔ نہ اس میں کتابیں خریدی جا سکتی ہیں جو علمی تحقیق کے لیے ناگزیر ہیں۔ نہ اس میں علمی رسالے خریدے جا سکتے ہیں جو نئی معلومات حاصل کرنے کے لیے ضروری ہیں۔ نہ اس میں بلند پایہ مضامین

لکھنے والوں کو اُنکے وقت اور ان کی محنت کا کم سے کم معاوضہ دیا جا سکتا ہے نہ اس میں اتنی گنجائش ہے کہ کسی ایک لائق آدمی کی بھی خدمات مستقل طور پر حاصل کی جا سکیں تاکہ وہ ادارت کے کاموں میں ایڈیٹر کا ہاتھ بٹا سکے۔ ایسی حالت میں پرچے کو نہ صرف زندہ رکھنے بلکہ اس کا معیار بھی قائم رکھنے کا تمام تر بار ایک تنہا شخص پر ہے۔ وہ اس دوگونہ مشکل میں مبتلا ہو گیا ہے کہ ایک طرف تو اپنا تمام وقت اور اپنی پوری دماغی قوت اس پرچے کی ترتیب میں صرف کرے اور دوسری طرف نہ صرف اپنی ذاتی ضروریات، بلکہ خود پرچے کی ضروریات کا بھی ایک معتد بہ حصہ کہیں اور سے فراہم کرے جس کے لیے نہ اس کے پاس کافی وقت بچتا ہے، اور نہ اس کے دل و دماغ میں اتنی طاقت باقی رہتی ہے کہ کوئی دوسرا کام کر سکے۔

اس حالت پر شکایت کا کوئی محل نہیں، اس لیے کہ ترجمان القرآن سے مسلمانوں کی کوئی غرض وابستہ نہیں ہے جس میں مدد نہ دینے کی کوئی شکایت ان سے کی جا سکے۔ یہ تو میری اپنی غرض ہے کہ میں اپنی آواز ان تک پہنچانا چاہتا ہوں۔ جو شخص کوئی ایک بھی دل خوش کن بات نہ سنا سکتا ہو بلکہ جس سے قریب قریب ہر گروہ کو کچھ نہ کچھ تلخ اور ناگوار طبع باتیں سننی پڑتی ہوں وہ نہ تو کسی سے مدد طلب کرنے کا حق رکھتا ہے اور نہ اس کو ایسی کوئی امید رکھنی چاہیے۔ درحقیقت مجھ پر ان لوگوں کا احسان ہے جو اس رسالہ کو پڑھ لیتے ہیں، اور اس سے زیادہ احسان ان کا ہے جو اسے پڑھنے کے ساتھ اس کی پوری یا ادھوری قیمت بھی ادا کرتے ہیں۔ اب اس کے بعد کسی مزید احسان کی درخواست نہ میں کر سکتا ہوں نہ کرنا چاہتا ہوں۔ رہی پرچے کی زندگی، تو جو حضرات اس کے خریدار ہیں ان کو میں اطمینان دلاتا ہوں کہ یہ پرچہ ان شاء اللہ اس وقت تک زندہ رہے گا جب تک میں زندہ ہوں۔ میں بے مقصد زندگی بسر کرنا نہیں چاہتا، اس لیے توفیق الٰہی سے جس قدر کوشش خود اپنے وجود کو برقرار رکھنے کے لیے کرتا ہوں اسی قدر کوشش اپنے مقصد وجود کو بھی برقرار رکھنے کے لیے کروں گا۔ لہٰذا کسی صاحب کو یہ خوف نہ ہو کہ پرچہ بند ہو جائے گا، اور بالفرض اگر بند بھی ہو گیا، تو خدا کے فضل سے میں امید رکھتا ہوں کہ کسی شخص کا ایک پیسہ بھی ضائع نہ ہونے پائے گا۔ جن لوگوں کے چندے باقی رہ جائیں گے ان کی پائی پائی واپس کر دی جائے گی۔

# بسلسلۂ فتنۂ تکفیر

## مولانا شبیر احمد عثمانی کا ایک خط اور اس پر تبصرہ

اشاعت گذشتہ میں تکفیر کے جس فتوے پر اظہار خیال کیا گیا تھا، اس کے متعلق جناب مولانا شبیر احمد صاحب عثمانی کے ایک شاگرد نے ہم کو مولانا کی ایک تحریر لا کر دی ہے جس میں مولانا نے اپنی پوزیشن صاف کرنے کی کوشش فرمائی ہے۔ یہ تحریر دراصل ایک خط ہے جو مولانا نے اپنے ایک نیازمند خاص کو لکھا تھا، مگر جن صاحب کے ذریعہ سے یہ خط ہم کو ملا ہے ان کا بیان ہے کہ وہ مولانا سے اس کو شائع کرنے کی اجازت حاصل کر چکے ہیں۔ لہٰذا ہم یہاں اس کو درج کرنے کے بعد اس پر ایک مختصر تبصرہ کریں گے۔

جناب مولانا تحریر فرماتے ہیں۔

"مجھے اوروں سے بحث نہیں، اپنی عبارت سے سروکار ہے، سمجھ میں نہیں آتا کہ الاصلاح والوں نے سہام ملام کا ہدف مجھے ہی سب سے زیادہ کیوں بنا رکھا ہے میری عبارت پڑھ جائیے، نہ کسی خاص شخص کا نام ہے نہ مستفتی نے ہم کو جو استفتاء دکھلایا تھا اس میں مولانا حمید الدین اور علامہ شبلی کا نام تھا میں نے یہی لکھا ہے کہ اگر یہ خیالات و مقالات کسی شخص کے متعین ہو جائیں تو بیشک یہ الحاد و زندقہ ہے ان سے احتراز واجب ہے۔ آسان بات تھی کہ یہ ثابت کر دیا جاتا کہ فلاں فلاں حضرات کے یہ عقائد نہیں، چلئے چھٹی ہوئی یا کم از کم مجھکو اس سے کچھ تعرض نہ رہتا

بلکہ خوشی ہوتی، کیونکہ متفتی صاحب کو معلوم ہے کہ میں نے اتنی عبارت ہی بجید کراہیت سے لکھی تھی۔ اپنا اصول یہ ہے کہ اس طرح کی بحثوں سے تا بحد امکان علٰحدہ رہے۔

مولنا حمید الدین صاحب کی کتابیں میں نے نہیں دیکھیں۔ ایک مرتبہ سرسری ملاقات ہوئی ہے، زیادہ احوال معلوم نہیں ہو سکے آپ نے جو کچھ ان کی عبادت و زہد کی طرف اشارہ فرمایا ہے۔ اس کی تکذیب کی کوئی وجہ نہیں، نہ مزید شہادت کی ضرورت ہے، میں کم از کم اپنے سے زیادہ آپ کو ثقہ سمجھتا ہوں۔

البتہ اہل علم جانتے ہیں کہ ان احوال کو نفس کفر و ایمان کی اساسی بحث میں دخل نہیں۔ یہ احوال بعض اوقات ایمان شرعی سے مفارق بھی ہو سکتے ہیں! دیکھیے یہ ان پر تعریض نہ سمجھیے۔ میں عام مسئلہ کی حیثیت سے عرض کر رہا ہوں۔ اب گذارش یہ ہے کہ الاصلاح والوں نے اپنے بعض رسائل اور اصل عبارات کی نقول میرے پاس بھیجی ہیں۔ مولنا حمید الدین فراہی کی جن دو عبارتوں پر مفتیان عظام نے تکفیر کی بنا رکھی تھی، میں غور و تامل کے بعد اس نتیجہ پر پہنچا کہ سوء تعبیر اور سماجت عنوان سے یہ عبارات خالی نہیں لیکن موجب تکفیر نہیں ہو سکتیں۔ (واللہ تعالیٰ اعلم) رہا مصنف الکلام کا معاملہ تو میں نے انکی تصانیف خود پڑھی ہیں۔ بلاشبہ متفتی نے بعض عبارات ایسی نقل کی ہیں جن میں ان کا عقیدہ مذکور نہ تھا بلکہ ملاحدہ کے اقوال تھے۔ مگر یہ دعویٰ کرنا درست نہیں کہ سب عبارات کا یہی حال ہے۔ میں خواہ مخواہ اس بحث کو طول دینا پسند نہیں کرتا۔ صرف الکلام صفحہ ۳۱ کی عبارت ذیل کی طرف توجہ دلاتا ہوں!

## "وجود باری"

"خدا کے اثبات پر قدماء اس طرح استدلال کرتے تھے کہ عالم حادث ہے اور جو چیز حادث ہے یعنی ازلی نہیں ہے وہ کسی علت کی محتاج ہے اور یہی علت خدا ہے۔ اس استدلال

کا دوسرا مقدمہ بدیہی ہے۔ پہلے مقدمہ پر یہ استدلال کیا جاتا تھا کہ عالم میں تغیر ہوتا رہتا ہے اور جو چیز تغیر پذیر ہے وہ حادث ہے۔ یہ استدلال بظاہر نہایت صاف اور واضح تھا اور اس لیے اس کی زیادہ چھان بین نہیں کی گئی لیکن وہ فی الواقع صحیح نہ تھا تمام چیزیں جو عالم میں موجود ہیں، دو چیزوں کا مجموعہ ہیں، مادہ اور ایک خاص صورت۔ جو چیز بدلتی رہتی اور تغیر پذیر ہے وہ صرف صورت ہے، اصل مادہ ہمیشہ قائم رہتا ہے۔ کوئی چیز جب فنا ہوتی ہے تو صرف اس کی صورت فنا ہوتی ہے اصل مادہ کسی نہ کسی صورت میں ہمیشہ موجود رہتا ہے۔ ایک کاغذ کو جلادو کاغذ جل کر راکھ ہوجائیگا۔ اب کاغذ فنا ہوگیا لیکن راکھ موجود ہے جو اصل مادہ کی ایک دوسری صورت ہے راکھ کو برباد کرو کسی نہ کسی صورت میں وہ قائم رہے گی، غرض جو چیز حادث ہے وہ صرف صورت ہے۔ اصل مادہ کے حادث ہونے پر نہ کوئی تجربہ پیش کیا جاسکتا ہے نہ کوئی استدلال قائم کیا جاسکتا ہے اس بنا پر عالم کو حادث کہنا صورت کے اعتبار سے صحیح ہے لیکن مادہ کے لحاظ سے صحیح نہیں اور جب عالم کا حدوث ثابت نہیں تو استدلال بھی صحیح نہیں ارسطو نے اسی اعتراض کے لحاظ سے استدلال کا دوسرا طریقہ اختیار کیا۔"

یہ عبارت کسی دوسرے کی نقل وحکایت نہیں نہ مجارات خصم کے لیے علیٰ سبیل التنزل کسی چیز کو فرض کیا گیا ہے، بلکہ خود مصنف اپنی طرف سے تحقیق وتنقیح کررہا ہے۔ اور دوسروں کے استدلال کو جو ایک صحیح مدعا کے ساتھ کیا جارہا تھا اپنے مزعومات کی بنا پر رد کرنا چاہتا ہے

یہی عبارت اس کی دلیل ہے کہ صفحہ ۴۹ کی عبارت ذیل میں جو چیز تسلیم کی ہے وہ محض بطور فرض محال نہیں لکھتے ہیں۔

"ہمکو اس سے انکار نہیں کہ عالم اجزائے دیمقراطیسی سے بنا ہے، ہمکو یہ بھی تسلیم ہے کہ عالم قدیم ہے، جیسا کہ خود مسلمانوں کے ایک بڑے فرقہ معتزلہ اور حکمائے اسلام فارابی، ابن سینا

اور ابن رشد کی رائے ہے۔ بلکہ جیسا کہ ابن رشد نے تلخیص المقال میں لکھا ہے خود قرآن مجید کی ان آیتوں سے (ان السموٰت والارض کانتا رتقا۔ وکان عرشہ علی الماء ثم استویٰ الی السماء وھی دخان) یہی متبادر ہوتا ہے۔ ہم یہ بھی تسلیم کرتے ہیں کہ مادہ کے اجزا متحرک ہیں حرکت مادہ کی ذاتیات میں سے ہے مختلف قوانین قدرت ہیں جن کے موافق اجزا باہم ملتے ہیں۔ ترکیب پاتے ہیں اور پھر ان میں خاص خاص قویٰ اور خواص پیدا ہو جاتے ہیں۔ لیکن کائنات کا عقدہ ان باتوں سے بھی حل نہیں ہوتا۔"

کیا عبارات بالا کے خلاف کسی جگہ اپنی کسی پچھلی تصنیف میں مادہ اور حرکت وغیرہ کے حدوث کی تصریح کی ہے اور اس خیال سے رجوع کر لیا ہے کم از کم میری نظر سے نہیں گذرا۔ اگر ایسا ہوا ہو تو انتہائی مسرت وطمانیت کا موجب ہے۔ غرض آنی ہے کہ تکفیر مسلم سے (معاذ اللہ) بندہ کو کوئی دلچسپی نہیں نہ میں اشخاص خصوصاً مشاہیر کی بحث میں الجھنا چاہتا ہوں الا یہ کہ ملجا و مکرہ کی حد تک پہنچا دیا جاؤں۔ اگر یہ شغل محبوب ہوتا اور بریلویوں کا رنگ (خدا نکردہ) قبول کر لیا جاتا تو اس داستان کو طویل بنا لینا کچھ مشکل نہ تھا۔ جو دلخراش جملے اور تفرعن آمیز تلمیحات جرائد میں الاصلاح والوں کی طرف سے استعمال ہو رہی ہیں وہ اللہ کے سپرد ہیں وہ ہی ہماری سب کی نیات پر مطلع ہے اور بندہ بھی باوجود خاطی و عاصی ہونے کے کچھ نہ کچھ خوف خدا دل میں رکھتا ہے۔ ساتھ ہی کسی کی مدح سرائی کی تمنا یا تجہیل تحمیق کا اندیشہ الحمد للہ اظہار حق میں کبھی مانع نہیں ہوا۔ اور اللہ سے دعا کرتا ہوں کہ آئندہ بھی مانع نہ ہو۔"

[ اس تحریر میں صرف ایک چیز ہے جس کو دیکھ کر ہمیں خوشی ہوئی، اور وہ یہ ہے کہ جناب مولانا نے کم از کم مولانا حمید الدین فراہی کے متعلق یہ تسلیم فرما لیا کہ انکی جن عبارات پر تکفیر کا فتویٰ دیا گیا تھا وہ بجائے خود موجب تکفیر نہیں۔ والحمد للہ علیٰ ذالک۔

لیکن ہمیں افسوس ہے کہ مولانا نے اب بھی یہ محسوس نہیں کیا کہ دراصل ان سے کس گناہ کا ارتکاب ہوا ہے؟ ایک خدا ترس مسلمان اور ایک ذمہ دار عالم دین کی حیثیت سے ان کا فرض کیا تھا اور انہوں نے واقع میں کیا کیا؟ وہ جس قسم کی توجیہیں پیش فرما رہے ہیں، ممکن ہے کہ وہ بندوں کو خاموش کرنے کے لیے اچھی تاویل وحجت ہوں، مگر ہمیں خوف ہے کہ خدا کی عدالت میں یہ توجیہیں کام نہیں آسکیں گی۔ اس لیے ہم ایک مرتبہ پھر احقاق حق کی کوشش کرتے ہیں۔ تاکہ مولانا اپنے اصلی گناہ کو سمجھ کر تاویل وحجت کے بجائے توبہ واستغفار فرمائیں اور آیندہ اس کے اعادہ سے مجتنب رہیں۔

یہ بالکل بجا ارشاد ہے کہ مستفتی نے استفتا میں مولانا شبلی اور مولانا حمید الدین کے نام نہیں لکھے تھے بلکہ اس نے صرف عبارتیں پیش کر کے فتویٰ لیا اور بعد میں ان دونوں حضرات کے نام لکھ کر اس فتوے کو شائع کر دیا۔ مگر ہم پوچھتے ہیں کہ کیا جناب والا کو یہ معلوم نہ تھا کہ ہندوستان میں بالعموم تکفیر کے فتوے کس غرض کے لیے اور کن کن ترکیبوں سے لیے جاتے ہیں آپ حضرات تو خود ایسے فتووں کے زخم خوردہ ہیں۔ بڑے بڑے زندہ اور مردہ علما، ومشائخ پر اس سے پہلے جو فتوے لکھوائے جا چکے ہیں، اور خود دیوبند کے اکابر کے خلاف جو فتوے صادر ہو چکے ہیں، کیا وہ سب خالص نیک نیتی کے ساتھ اصلاح خیال کی غرض سے لیے گئے تھے؟ یا ان کی اصل غرض یہ تھی کہ ایک جماعت کے خلاف بدگمانیاں پھیلا کر مسلمانوں میں اس کو ساقط الاعتبار کیا جائے اور اس کے مقابلہ میں خود اپنا اعتبار قائم کیا جائے؟ سابق کے تمام تجربات گواہ ہیں کہ اس قسم کے فتوے اسی دوسری غرض کے لیے حاصل کیے جاتے ہیں اور ان میں اکثر ناموں کو چھپا کر اور اصل عبارتوں کو کاٹ چھانٹ کر استفتا کیا جاتا ہے جب یہ حالات آپ کو معلوم تھے تو کیا احتیاط کا مقتضیٰ یہ نہ تھا کہ آپ مستفتی سے مطالبہ کرتے کہ وہ ان لوگوں کے نام ظاہر کرے

جن کی عبارتیں وہ پیش کر رہا ہے؟ آخر یہ فرض آپ پر کس نے عائد کیا تھا کہ مستفتی جو صورت مسئلہ جس طور پر آپ کے سامنے پیش کرے اُس پر آپ مجبوراً اُسی طرح فتویٰ تحریر فرما دیں؟ دوسرے مسائل میں آپ کا جو طریقہ بھی ہو اس سے ہم کو بحث نہیں۔ مگر تکفیر کے معاملہ میں تو آپ کو سمجھنا چاہیے کہ یہ بڑی ذمہ داری کا کام ہے۔ اس سے امت میں سخت فتنے پھیل سکتے ہیں اور پھیلائے جا چکے ہیں۔ اس معاملہ میں گم نام عبارتوں پر فتویٰ لکھ کر مستفتی کے حوالہ کر دینا بالکل ایسا ہے جیسے آپ کسی کو اپنا خنجر دے کر اسے مجاز کر دیں کہ آپ کی طرف سے جس کو چاہے ذبح کر دے

آپ فرما سکتے ہیں کہ ہم مفتی ہیں، قاضی نہیں ہیں۔ بالکل درست۔ مگر کیا مفتی اسلام پر تحقیق و تفتیش اور احوال زمانہ کے ملاحظہ، اور مصالح امت کی رعایت کا قطعاً کوئی فرض عائد نہیں ہوتا؟ اور کیا شریعت میں مفتی کو بالکل مستفتی کا پابند کر دیا گیا ہے کہ وہ مستفتی کے ہر سوال کا جواب ضرور ہی دے اور انہی قیود کے اندر دے جن میں استفتا کیا گیا ہو؟

ہم تسلیم کرتے ہیں کہ جناب والا نے "اگر" اور "تو" کی بہت ہی قانونی قیود کے ساتھ فتویٰ تحریر فرمایا ہے۔ یہ احتیاط بھی شکریہ کے قابل ہے لیکن شائد جناب نے غور نہ فرمایا کہ اس شرط و جزا کے ساتھ فتویٰ لکھ کر مستفتی کے حوالہ کر دینے کے معنی کیا ہیں؟ جناب نے اس کو لکھا کہ "اگر یہ مقالات کسی شخص کے متعین ہو جائیں تو اس کے الحاد و زندقہ ہونے میں کوئی شبہ نہیں اور ایسے زنادقہ کی اعانت بالکل حرام ہے"۔ وہ اس تحریر کو لے گیا اور معاً مستفتی نے قاضی کی حیثیت اختیار کر کے اس نے فیصلہ صادر کر دیا کہ یہ خیالات و مقالات مولانا شبلی اور مولانا حمید الدین کے متعین ہو گئے، لہذا وہ اور ان کے تلامذہ و متبعین زنادقہ ہیں۔ اور ان کی اعانت حرام ہے۔ غور فرمائیے۔ یہ خنجر جو اس نے دو مرحوم مسلمانوں کی قبروں میں اور بہت سے زندہ مسلمانوں کے سینوں میں بھونک دیا کیا یہ جناب ہی کا عطا کردہ نہ تھا؟ اور کیا آپ ہی

نے اس کو اجازت عامہ عطا فرمائی تھی کہ جہاں چاہے آپ کی بتائی ہوئی شرط متعین کر کے جزا کا خنجر استعمال کر ڈالے؟ اپنی مفتیانہ ذمہ داریوں کو ادا کرنے میں اتنی عظیم اور خطرناک بے احتیاطی برتنے کے بعد بھی آپ یہ سمجھتے ہیں کہ آپ کا دامن خون ناحق سے بالکل پاک ہے۔

پھر عملاً اس احتیاطی کا نتیجہ کیا ہوا؟ آپ کا اور دوسرے علمائے کرام کا فتویٰ بصورت رسالہ ایک کثیر تعداد میں شائع کیا گیا۔ اس فتوے کی بنیاد پر اشتہارات طبع کرائے گئے جن میں مولانا شبلی اور مولانا حمید الدین کی جماعت کے لوگوں کو راجپال (مشہور شاتم رسول) سے بھی بدتر قرار دیا گیا اور مدرسۂ اصلاح جیسی خالص دینی درگاہ کے متعلق لکھا گیا کہ وہاں سے کفر و الحاد کا دھواں اٹھ رہا ہے اور وہاں کے معلمین نے اسلام کو بیخ و بن سے اکھاڑنے کے لیے ایک زہریلی اسکیم تیار کی ہے۔ یہ اشتہارات دیہات و قصبات کے سیدھے سادے مسلمانوں میں تقسیم کیے گئے، ان کے دلوں میں چند مخلص مسلمانوں کے خلاف نفرت و عداوت کے جذبات بھڑکائے گئے۔ اور ان سے کہا گیا کہ یہی وہ زنادقہ ہیں جن کی اعانت کو مفتیان عظام نے حرام قرار دیا ہے۔ فرمائیے کہ اس فتنے اور اس ظلم عظیم میں جو ہتھیار استعمال کیا گیا وہ آپ کا نہیں تو اور کس کا دیا ہوا تھا؟ جائے حیرت ہے کہ اپنے فعل کے یہ نتائج ظاہر ہو جانے پر بھی آپ شرمسار نہیں ہوتے، توبہ و استغفار نہیں کرتے، بلکہ الٹی شکایت فرماتے ہیں کہ ہم کو سہام ملامت کا نشانہ کیوں بنایا جاتا ہے، ہمارے خلاف دلخراش جملے اور تنفر آمیز تلمیحات کیوں استعمال کیے جاتے ہیں، ہماری تجہیل و تحمیق کیوں کی جاتی ہے؟ یا سبحان اللہ آپ نے تو تکفیر و تفسیق فرمائی ہے جس سے بڑھ کر کوئی زیادتی ایک مسلمان دوسرے مسلمان پر کر ہی نہیں سکتا۔ اس کے بعد اگر کسی نے تجہیل و تحمیق کی تو بہت کمی کی۔ جزاء سیئة سیئة مثلہا کے قاعدے سے تو وہ اس سے زیادہ کا حق رکھتا تھا۔

آپ فرماتے ہیں "آسان بات تھی کہ یہ ثابت کر دیا جاتا کہ فلاں فلاں حضرات کے یہ عقائد نہیں، چلیے چھٹی ہوئی"۔ ہم عرض کرتے ہیں کہ اس سے بہت زیادہ آسان بات یہ تھی کہ جناب تحقیق کیے بغیر فتویٰ لکھنے سے انکار فرما دیتے۔ مگر اب کہ آپ فتویٰ دے چکے، اور وہ فتویٰ تعیین اشخاص کے ساتھ شائع بھی کر دیا گیا، اور اس فتوے کی بنا پر گاؤں گاؤں اور قصبہ قصبہ اشتہار بازی بھی ہو چکی، صرف اتنی سی بات سے چھٹی کیوں کر ہو سکتی ہے کہ محض فلاں فلاں حضرات کی صفائی آپ کے سامنے پیش کر دی جائے اور آپ خاموشی کے ساتھ ان کے اسلام کا سرٹیفکٹ دے دیں۔ یہ فتنہ جو آپ کی بے احتیاطی سے مسلمانوں میں پھیل گیا ہے اس کا علاج کون کرے گا؟ یہ نقصان جو آپ کے ہاتھوں سے ایک دینی درسگاہ کو پہنچ گیا ہے اس کی تلافی کون کریگا؟ الاصلاح والے آخر کس جرم کے مجرم ہیں کہ وہ اس کی پاداش میں بدنامی اور اپنے مشن کا نقصان اٹھائیں؟

جناب مولنا کی تحریر سے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ انہوں نے مولانا حمید الدین کو تو مسلمان تسلیم فرما لیا۔ مگر مولنا شبلی مرحوم ابھی تک ان کی نظر میں زندیق ہیں۔ اس کے ثبوت میں جو عبارات انہوں نے پیش فرمائی ہیں ان کو ہم نے پہلے بھی دیکھا تھا اور اب پھر دیکھا۔ ان میں غلطی ضرور ہے اور الکلام میں ایسی بہت سی غلطیاں موجود ہیں جن کی اصل وجہ یہ ہے کہ مصنف مرحوم زیادہ تر انیسویں صدی کے سائنس سے متاثر تھے اور اس کا بھی انہوں نے کوئی گہرا تنقیدی مطالعہ نہیں کیا تھا۔ لیکن ان غلطیوں کے باوجود الکلام میں قطعاً کوئی چیز ایسی نہیں ہے جس کی بنا پر اس کے مصنف کو ملحد و زندیق قرار دیا جا سکتا ہو۔ جو شخص مادے کو مخلوق اور خدا کو اس کا خالق مانتا ہو اس کو ملحد و زندیق کہنا کم از کم اس شریعت کی رو سے تو ممکن نہیں جو محمد صلی اللہ علیہ وسلم پر نازل ہوئی تھی۔ البتہ اگر کوئی شریعت اس کے بعد نازل

ہوئی ہو جس میں حدوث و قدم کی بنا پر کفر و ایمان کے درمیان از سرِ نو تمیز قائم کی گئی ہو تو نہ ہم کو اس کا علم ہے اور نہ خداوند علیم و خبیر کو۔ ہماری سمجھ میں نہیں آتا کہ علمائے اسلام پر یہ مدرسیت کا استیلا کب تک رہے گا۔ یونانی فلسفہ کے اثر سے جو علم کلام صدیوں پہلے پیدا ہوا تھا اور اس علم کی اصطلاحوں میں متکلمین کے ایک خاص گروہ نے اسلامی عقائد کا جو ایک تکراری بیان مرتب کر دیا تھا، اس کے خلاف جہاں کسی کی زبان سے کوئی لفظ نکلا اور بے تکلف اس کو ملحد، زندیق، کافر کہدیا گیا۔ پھر اس سے کوئی بحث نہیں کی جاتی کہ اس کی نیت کیا ہے، اور اس نیت کے لیے قرآن کے بتائے ہوئے دائرۂ ایمان میں بھی کوئی گنجائش ہے یا نہیں۔ مولانا شبلی نے اگرچہ بعد میں تصریح کے ساتھ یہ اعلان فرما دیا تھا کہ وہ مادے کو حادث مانتے ہیں۔ (ملاحظہ ہو الاصلاح بابت ماہ اگست ۱۹۳۶ء ص ۲۵) لیکن یہاں ایک اصولی بحث ہے جس کو طے کرنا ضروری ہے۔ بالفرض اگر وہ مادے کو قدیم کہتے ہیں، اور اس کے باوجود یہ عقیدہ رکھتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے اس کو پیدا کیا ہے (جیسا کہ الکلام میں تصریح لکھا ہے)۔ تو فرمائیے کہ قرآن کی کونسی آیت ہے جس کی رو سے آپ ان کو زندیق قرار دے سکتے ہیں؟

جیسا کہ ہم اپنے پچھلے مضمون میں الکلام کی عبارتوں سے ثابت کر چکے ہیں، مولانا شبلی مرحوم نے دراصل حدوث عالم کا انکار نہیں کیا ہے، بلکہ متکلمین اسلام اور جدید مادہ پرستوں کے دلائل کا موازنہ کر کے یہ واضح کرنے کی کوشش کی ہے کہ وجود باری کے اثبات میں حدوث عالم سے جو استدلال کیا گیا تھا، اور جو اب تک ہمارے علم کلام میں سب سے زیادہ مقبول استدلال تھا، وہ زمانہ حال کے مادیین کے مقابلہ میں نہیں ٹھیر سکتا، اور اب اس کو پیش کرنا اثبات مدعا کے لیے کافی نہیں ہے۔ اس کی توضیح کے بعد انہوں نے یہ ثابت کیا ہے کہ وجود باری اور توحید باری پر بہترین طرز استدلال وہ ہے جو قرآن مجید میں اختیار کیا گیا ہے۔

مولٰنا شبیر احمد صاحب براہ کرم پھر ایک مرتبہ الکلام ملاحظہ فرمائیں اور خاص طور پر صفحہ ۳۵ تا ۳۹ اور صفحہ ۴۵ تا ۶۲ کو بغور پڑھیں۔ ان کو خود معلوم ہو جائے گا کہ غریب مصنف محض اس جرم کا مرتکب ہے کہ وہ متکلمین کے طرز استدلال پر قرآن کے طرز استدلال کو ترجیح دے رہا ہے۔ خدا نہ کرے کہ یہ تحقیق ہو جانے کے بعد بھی مولٰنا ایسے شخص کو زندیق قرار دینے کی جرأت فرمائیں۔

اس تکفیر کے تصفیہ سے ہم کو جو کچھ بھی دلچسپی ہے وہ کسی شخصیت کی خاطر نہیں ہے۔ بلکہ در اصل ہم اس کفر بازی کا دروازہ بند کرنا چاہتے ہیں ہم اپنے پچھلے مضمون میں صاف طور پر لکھ چکے ہیں کہ مسلمانوں کی جمعیت کے لیے تکفیر بیجا سے بڑھ کر کوئی فتنہ نہیں ہے۔ اور خصوصاً موجودہ ضعف و انتشار کی حالت میں تو اسلام کے ساتھ بد ترین دشمنی اگر کوئی ہوسکتی ہے تو وہ یہ ہے کہ مسلمان ایک دوسرے کی تکفیر کو کھیل بنالیں۔ پس جس قدر بھی قوت اللہ نے ہم کو دی ہے اسے ہم اس فتنے کے سدباب میں صرف کر دیں گے۔ یہی غرض ہے جس کے لیے ہم نے اُن اکابر علماء کے خلاف اظہار خیال کیا جن کی پوری عزت و حرمت ہمارے دل میں بھی اور رہے۔ خود ہمارے اُستاد مولٰنا اشفاق الرحمٰن صاحب ان حضرات میں شریک ہیں جنہوں نے اس فتوے پر دستخط کیے ہیں مگر استاد کے ادب نے بھی ہم کو اس ظلم کی مخالفت سے باز نہ رکھا۔ اس کے بعد بھی اگر کوئی شخص ہم سے شکایت کرے تو ہم مجبور ہیں کہ اس کی شکایت سے بے پروا ہو کر اپنا فرض انجام دیں۔ اسلام کی محبت ہر محبت پر مقدم اور اسلام کی مصلحت ہر مصلحت سے زیادہ اہم ہے۔

# مقالات

# بشارات الانبیاء

## نبوت محمدی صلعم کے متعلق انبیائے سابقین کی پیشنگوئیاں

(۶)

از جناب مولوی فضل حق صاحب

## اٹھارویں بشارت

یہ بشارت انجیل یوحنا کے آخری ابواب میں ہے۔ باب ۱۴ میں لکھا ہے:-

"اگر تم مجھ سے محبت رکھتے ہو تو میرے حکموں پر عمل کرو۔ اور میں باپ سے درخواست کروں گا تو وہ تمہیں دوسرا فارقلیط[ل] بخشے گا کہ ابد تک تمہارے ساتھ رہے۔ یعنی روح حق جسے دنیا نہیں پا سکتی کیونکہ اسے نہ دیکھتی ہے نہ جانتی ہے لیکن تم اسے جانتے ہو کیونکہ وہ تمہارے ساتھ ہے اور تم میں ہو گی"۔ (آیت ۱۵-۱۶-۱۷)

"لیکن وہ فارقلیط یعنی روح القدس جسے باپ میرے نام سے بھیجے گا وہی تمہیں

---

[ل] ۱۸۱۲ء، ۱۸۳۱ء اور ۱۸۴۴ء کے عربی ترجمہ میں لفظ فارقلیط ہی لکھا تھا۔ جدید عربی ترجمہ جو برٹش اینڈ فارن بائبل سوسائٹی نے شائع کیا ہے اس میں اس لفظ کو بدل کر المعزی لکھدیا گیا ہے۔ ۱۸۱۸ء کے اردو ترجمہ میں اس کا ترجمہ "تسلی دینے والا" لکھا تھا۔ بعد میں اس کو بدل کر "مددگار" لکھا گیا۔ انگریزی ترجمہ میں لفظ Confortter استعمال کیا گیا ہے۔

سب باتیں سکھائے گا اور جو کچھ میں نے تم سے کہا ہے وہ سب تمہیں یاد دلائے گا۔ (آیت ۲۶)
اور اب میں نے تم سے اس کے ہونے سے پہلے کہہ دیا ہے تاکہ جب وہ وقوع میں آئے
تو تم ایمان لاؤ۔ اس کے بعد میں تم سے بہت کلام نہ کروں گا کیونکہ اس جہان کا
سردار آتا ہے اور مجھ میں اس کی کوئی چیز نہیں" (آیت ۲۹-۳۰)۔

اس کے بعد باب پندرہ میں پھر لکھا ہے :-

لیکن جب وہ فارقلیط آئے گا جس کو میں تمہارے پاس باپ کی طرف سے
بھیجوں گا، یعنی روح حق جو باپ سے نکلتی ہے، تو وہ میری گواہی دے گا، اور تم
بھی گواہی دو گے کیونکہ تم شروع سے میرے ساتھ ہو" (آیت ۲۶-۲۷)

پھر باب ۱۶ میں اس طرح لکھا ہے :-

لیکن میں تم سے سچ کہتا ہوں کہ میرا جانا ہی تمہارے لیے فائدہ مند ہے۔
کیوں کہ اگر میں نہ جاؤں تو وہ فارقلیط تمہارے پاس نہ آئے گا لیکن اگر میں
جاؤں گا تو اسے تمہارے پاس بھیج دوں گا، اور جب وہ آئے گا تو دنیا کو گناہ اور
راستی اور عدالت کے بارے میں قصوروار ٹھیرائے گا۔ گناہ کے بارے میں اس لیے کہ وہ
مجھ پر ایمان نہیں لائے راستی کے بارے میں اس لیے کہ میں باپ کے پاس جاتا ہوں اور
تم مجھے پھر نہ دیکھو گے۔ عدالت کے بارے میں اس لیے کہ دنیا کے سردار پر حکم کیا گیا ہے۔
مجھے تم سے بہت سی باتیں کہنی ہیں مگر ابھی تم ان کے تحمل کی قوت نہیں رکھتے۔ جب وہ
یعنی روح حق آئے گا تو تم کو سچائی کا پورا راستہ بتائے گا۔ اس لیے کہ وہ اپنی طرف
سے نہ کہے گا بلکہ جو کچھ سنے گا وہی کہے گا، اور تمہیں آیندہ کی خبریں دے گا۔ وہ میری
بزرگی ظاہر کرے گا۔ اس لیے کہ جو کچھ میرے پاس ہے وہ اُسی سے لے گا اور

تمہیں بتائے گا۔ سب چیزیں جو باپ کی ہیں وہ میری ہیں اس لیے میں نے کہا کہ جو کچھ میرے پاس ہے وہ اسی سے لے گا اور تمہیں بتائے گا۔" (آیت ۷ تا ۱۵)۔

ان عبارات پر کلام شروع کرنے سے پہلے دو باتوں کی طرف توجہ دلانا ضروری ہے:

(۱) ہم اس سے پہلے اپنے مقدمات میں اس حقیقت کو ظاہر کر چکے ہیں کہ قدیم زمانے سے جدید زمانے تک اہل کتاب کی یہ عادت رہی ہے کہ وہ اکثر و بیشتر اسمار و اعلام کے ترجمے کر دیا کرتے ہیں۔ نیز یہ بھی ہم لکھ چکے ہیں کہ عیسیٰ علیہ السلام کی مادری زبان جس میں انہوں نے اپنے دین کی تبلیغ کی، عبرانی تھی نہ کہ یونانی۔ اب اس میں کوئی شبہ نہیں کہ ان عبارات میں جس آنے والے کی بشارت دی گئی ہے اس کے لیے حضرت عیسیٰ نے عبرانی میں کوئی خاص لفظ استعمال کیا ہوگا۔ انجیل یوحنا کے مصنف نے اس لفظ کا ترجمہ یونانی میں کیا۔ پھر اس یونانی لفظ کے بھی مختلف ترجمے عربی، فارسی، انگریزی، اردو اور دوسری زبانوں میں کر دیے گئے۔ عربی کے تمام قدیم ترجموں میں اس لفظ کا ترجمہ "فارقلیط" کیا گیا ہے اس لفظ کی تحقیق کرتے ہوئے ایک پادری اپنے ایک رسالہ میں (جو ۱۲۶۶ھ میں کلکتہ سے بزبان اردو شائع ہوا تھا) لکھتا ہے:۔

"یہ لفظ یونانی الاصل ہے جس کو معرب کر لیا گیا ہے۔ اگر اس کی اصل پارکلیتوس قرار دی جائے تو اس کے معنیٰ "تسلی دینے والے" "مددگار" اور "وکیل" کے ہوں گے اور اگر اس کی اصل پیرکلیتوس قرار دی جائے تو وہ محمد اور احمد کے معنی سے بہت

---

لہ اردو ترجمے میں یہ فقرہ اس طرح لکھا ہے: "مجھ ہی سے حاصل کر کے تمہیں خبریں دے گا" لیکن عربی ترجمے کے الفاظ ہیں: لانہ یاخذ مما ھو لی ویخبرکم۔ اور انگریزی ترجمے میں یوں لکھا ہے۔

He shall receive of mine and shall shew it unto you.

قریب ہوگا۔"

مصری فاضل ڈاکٹر محمد توفیق صدقی نے اس لفظ کی جو تحقیق کی ہے وہ بھی قابل دید ہے:

"یہ لفظ فارقلیط یونانی ہے اور انگریزی میں اس کو Paraclete لکھا جاتا ہے جس کے معنی "تسلی دینے والے" کے ہیں، اور ضمناً "محبت کرنے والے" کا مفہوم بھی اس سے نکلتا ہے، جیسا کہ پوسٹ نے اپنی قاموس میں لکھا ہے۔ اس کے علاوہ ایک دوسرا لفظ بھی ہے جو انگریزی حروف میں Periclite لکھا جاتا ہے اور اس کے معنی "بلند پایہ" "جلیل القدر" "عالی مقام"، "بزرگ" اور "نام ور" کے ہیں۔ یہ سب معنی محمد اور احمد اور محمود سے اقرب ہیں۔ اب یہ بات پوشیدہ نہیں کہ مسیح علیہ السلام جس زبان میں کلام کرتے تھے وہ عبرانی تھی۔ ہم نہیں کہہ سکتے کہ اصل لفظ جو انہوں نے استعمال کیا تھا، وہ کیا تھا؟ اور ہم یہ بھی نہیں جانتے کہ اس انجیل کے مولف نے اس کا ترجمہ لفظ "فارقلیط" سے جو کیا ہے وہ اس کا پورا مفہوم ادا کرتا ہے یا نہیں؟ ہم کو یہ بھی خبر نہیں کہ اس لفظ کا یہی ترجمہ پہلے بھی کیا گیا تھا یا نہیں؟ خود عیسائی مصنفین اس کا اقرار کر چکے ہیں کہ عہد قدیم اور عہد جدید دونوں کے ترجموں میں الفاظ اور عبارات بدلتی رہی ہیں اس لیے یقین کے ساتھ نہیں کہا جا سکتا کہ ابتدا سے لفظ ( Paraclete ) ہی اصل عبرانی لفظ کا ترجمہ کیا گیا ہے۔ بہت ممکن ہے کہ اصل میں ( Periclite ) استعمال کیا گیا ہو اور بعد میں سہواً یا عمداً اس کو Paraclete کر دیا گیا ہو۔ یونانی زبان میں یہ دونوں لفظ اس قدر مشابہ ہیں کہ ایک کا دوسرے سے بدل جانا کچھ بعید نہیں۔"

ان تصریحات سے یہ بات ظاہر ہو جاتی ہے کہ دونوں لفظوں میں بہت کم فرق ہے اور یونانی حروف اس قدر متشابہ ہیں کہ پیرکلیتوس کا پارکلیتوس سے مبدل ہو جانا بالکل قرین قیاس ہے۔

بعد میں اہل تثلیث نے یہ دیکھ کر کہ مقدم الذکر لفظ محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے اسم مبارک سے بہت قریب المعنی ہے، اس امر پر اصرار کیا کہ دراصل موخر الذکر لفظ ہی صحیح ہے۔ جن لوگوں نے مسیحی علماء کی روش کا بنظر انصاف مطالعہ کیا ہے وہ تسلیم کریں گے کہ ان حضرات کی دیانت سے یہ امر بعید نہیں، بلکہ وہ ایسی تحریف کو نہایت مستحسن اور کار ثواب سمجھتے ہیں۔

(۲) محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے ظہور سے پہلے بعض لوگوں نے دعویٰ کیا تھا کہ ہم "فارقلیط" کے مصداق ہیں مثلاً منتس مسیحی جو دوسری صدی عیسوی میں گذرا ہے۔ یہ ایک نہایت مرتاض شخص تھا اور اپنے عہد میں بڑا پرہیزگار سمجھا جاتا تھا۔ اس نے بلاد روم (ایشیا کوچک) میں ۱۸۷ء کے قریب زمانہ میں رسالت کا دعویٰ کیا اور کہا کہ میں ہی وہ فارقلیط ہوں جس کی آمد کا عیسیٰ علیہ السلام نے وعدہ کیا تھا۔ بہت سے لوگوں نے اس کے دعوے کو قبول کر لیا اور اس پر ایمان لے آئے۔ سر ولیم میور نے اس کا حال لکھا ہے۔

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ مسیح کے بعد ابتدائی صدیوں میں لوگ فارقلیط کے منتظر تھے مدعیوں نے فارقلیط ہونے کا دعویٰ بھی کیا، اور بہت سے مسیحیوں نے ان کے دعووں کو قبول بھی کیا۔ لب التواریخ کا عیسائی مصنف لکھتا ہے:-

> "محمد کے ہم عصر یہودی اور مسیحی ایک نبی کے منتظر تھے اس سے محمد کو بہت فائدہ پہنچا کیونکہ ان کا دعویٰ یہ تھا کہ میں ہی وہ نبی منتظر ہوں"۔

اس کلام سے بھی یہ ثابت ہوتا ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ میں لوگ ایک نبی کے ظہور کا انتظار کر رہے تھے۔ اسی بنا پر جب نجاشی شاہ حبش کے پاس آنحضرت کا نامۂ مبارک پہنچا تو وہ پڑھتے ہی بول اٹھا کہ "میں خدا کو گواہ کر کے کہتا ہوں کہ یہی وہ نبی ہے جس کا انتظار اہل کتاب کر رہے تھے" پھر جواب میں آپ کو لکھا کہ "میں شہادت دیتا ہوں کہ آپ اللہ کے

صادق اور مصدق رسول ہیں میں نے آپ سے بیعت کی اور آپ کی طرف سے آپ کے چچازاد بھائی (جعفر بن ابی طالب) کے ہاتھ پر ایمان لایا"۔ یہ بادشاہ اسلام سے پہلے نصرانی تھا۔

مُقَوْقِس شاہ مصر کو جب آنحضرت کا دعوت نامۂ اسلام پہنچا تو اس نے جواب میں لکھا

"میں نے آپ کا خط پڑھا اور جو کچھ آپ نے لکھا ہے اسے سمجھا اور جس چیز کی طرف آپ دعوت دے رہے ہیں اس کو دیکھا۔ مجھے معلوم تھا کہ ابھی ایک نبی آنے والا رہ گیا ہے۔ میں سمجھتا تھا کہ وہ شام میں ظاہر ہوگا۔ میں نے آپ کے قاصد کے ساتھ عزت کا برتاؤ کیا ہے"۔

یہ بادشاہ اسلام نہیں لایا، مگر اس نے اپنے خط میں اقرار کیا کہ ایک نبی اور آنے والا رہ گیا ہے۔ اب یہ ظاہر ہے کہ اس وقت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس کوئی ایسی زبردست دنیوی طاقت نہ تھی کہ یہ بادشاہ ڈر کر اس بات کا اقرار کرتے۔ لامحالہ ان باتوں سے یہی نتیجہ نکالا جائے گا کہ فی الواقع اس وقت عیسائیوں میں عام طور پر فارقلیط کی آمد کا انتظار کیا جا رہا تھا۔

ایک نصرانی عالم جارود بن علا اپنی قوم کے ساتھ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوا اور اس نے عرض کیا کہ:۔

"خدا کی قسم! حق کے ساتھ آئے ہیں، اور آپ نے جو کچھ فرمایا ہے سچ فرمایا ہے۔ اس ذات کی قسم جس نے آپ کو حق کے ساتھ نبی بنا کر بھیجا ہے، میں نے انجیل میں آپ کی تعریف پائی ہے، اور مریم عذرا کا بیٹا آپ کی بشارت دے چکا ہے پس تحیۃ و سلام ہو آپ پر اور مشکور ہے وہ جو آپ کی عزت کرے۔ آنکھ سے دیکھ لینے کے بعد کسی اور نشان کی ضرورت نہیں اور یقین کے بعد شک کی گنجائش نہیں ہاتھ بڑھائیے اور میں

گواہی دیتا ہوں کہ خدا کے سوا کوئی الٰہ نہیں اور آپ خدا کے رسول ہیں"۔

اس قسم کی متعدد مثالیں تاریخ میں اور بھی ملتی ہیں جن سے ہمارے مذکورہ بالا بیان کی تائید ہوتی ہے۔

ان دو امور کی توضیح کے بعد ہم کہتے ہیں کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے اپنی زبان میں جو لفظ استعمال کیا تھا اس کا تو اب کہیں پتا نہیں۔ صرف اس کا یونانی ترجمہ باقی رہ گیا ہے اب یہ بحث بے نتیجہ ہے کہ اصل عبرانی لفظ کیا ہوگا۔ ہم جو کچھ بھی نتیجہ نکال سکتے ہیں، یونانی ترجمہ ہی سے نکال سکتے ہیں۔ اس ترجمہ میں بھی دو احتمال ہیں۔ اگر یہ تسلیم کر لیا جائے کہ اصل ترجمہ "پیرکلیتوس" تھا تب تو یہ بات بالکل ظاہر ہو جاتی ہے کہ اس سے مراد محمد صلی اللہ علیہ وسلم ہی ہیں، کیونکہ وہ آپ کے اسم مبارک کا قریب قریب لفظی ترجمہ ہے لیکن عیسائی اس احتمال کو نہیں مانتے اس لیے ان کی خاطر سے ہم اس احتمال کو بھی چھوڑے دیتے ہیں۔ اب صرف پارکلیتوس (فارقلیط) باقی رہ جاتا ہے جس کے معنی "تسلی دہندہ" "مددگار" اور "حجت کرنے والا" (وکیل) کے کیے گئے ہیں۔ ۱۸۱۶ء کے عربی ترجمہ میں "شافع" کیا گیا ہے۔ اگر تسلیم کر لیا جائے کہ یہی صحیح ہے، اور حضرت عیسیٰ نے جو کچھ فرمایا تھا اس کا صحیح مفہوم یہی ہے، تب بھی ہمارا یہ دعویٰ بجائے خود قائم رہتا ہے کہ اس سے مراد وہ روح نہیں ہے جو عید پنتکست کے دن حضرت عیسیٰ کے شاگردوں پر نازل ہوئی تھی (جیسا کہ کتاب الاعمال باب ۲ میں بیان ہوا ہے) بلکہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم ہی مراد ہیں۔ ہمارے اس دعوے کے لیے خود اس بشارت ہی میں حسب ذیل دلائل موجود ہیں:-

(۱) حضرت عیسیٰ نے فارقلیط کی خبر دینے سے پہلے تنبیہ کے طور پر فرمایا کہ "اگر تم مجھ سے محبت کرتے ہو تو میرے حکموں پر عمل کرو"۔ اس سے مقصود یہ تھا کہ جو کچھ بعد میں کہا جانے والا ہے، اسے متبعین سمجھ لیں کہ وہ خاص اہمیت رکھتا ہے اور اس کی رعایت ضروری ہے۔ اگر فارقلیط سے مراد

وہی روح ہوتی جو شاگردوں پر نازل ہونے والی تھی تو اس فقرہ کی کوئی حاجت نہ تھی؛ کیونکہ یہ گمان کرنے کی کوئی وجہ نہ تھی کہ حواریین جو اس سے پہلے بھی اس روح کے نزول سے مستفیض ہو چکے تھے، ایک بار پھر اس کے نازل ہونے کو مستبعد سمجھیں گے۔ بلکہ اگر وہ پہلے نازل نہ بھی ہو چکی ہوتی تب بھی استبعاد کی کوئی وجہ نہ تھی، کیونکہ جب روح کسی کے قلب پر نازل ہو گی اور اس میں حلول کر جائے گی تو لامحالہ اس کا نمایاں اثر ظاہر ہوگا، پھر اس گمان کی کیا وجہ ہو سکتی ہے کہ متاثر شخص اس سے انکار کر دے گا۔ انکار و استبعاد کا اندیشہ اور اس کا سدباب کرنے کے لیے پہلے سے تنبیہ کر دینا تو اسی وقت جائز ہو سکتا ہے جبکہ بشارت کا ظہور کسی ایسی صورت میں ہونے والا ہو جو انسانی فطرت اور انسان کے سابق طرزِ عمل کو دیکھتے ہوئے انکار و استبعاد کی محل بھی جا سکتی ہو اور رہ چکی ہو، اور یہ صورت ایک بشر رسول کی صورت ہی ہو سکتی ہے۔ مسیح علیہ السلام دیکھ چکے تھے کہ پچھلی امتوں نے ہمیشہ نبیوں کو جھٹلایا۔ اس لیے انہوں نے اپنے متبعین کو آنے والے نبی کی خبر دینے سے پہلے تنبیہ کر دی کہ وہ اس کی تکذیب نہ کریں۔

(۲) یہ روح جو شاگردوں پر نازل ہوئی تھی، مسیحی اعتقاد کے بموجب باپ سے تو مطلقاً متحد ہے، اور بیٹے سے باعتبار اس کی لاہوتیت کے حقیقتہً متحد ہے۔ پھر اس کو "دوسرا فارقلیط" کہنا کیونکر صحیح ہو سکتا تھا۔ البتہ اگر مخبر عنہ کوئی نبی ہو تو کسی تکلف کے بغیر یہ الفاظ اس پر صادق آسکتے ہیں۔

(۳) وکالت اور شفاعت، خواص نبوت میں سے ہیں نہ کہ اس روح کے خواص میں سے جو اللہ کے ساتھ متحد بتائی جاتی ہے۔ پس اگر فارقلیط کے معنی وکیل اور شفیع کے ہیں تو یہ لفظ روح پر صادق نہ آئے گا بلکہ ایک نبی ہی پر صادق آئے گا۔

(۴) عیسیٰ علیہ السلام فرماتے ہیں کہ "جو کچھ میں نے تم سے کہا ہے وہ سب تمہیں یاد دلائے گا" عہد جدید کے رسائل میں سے کسی رسالہ سے بھی یہ ثابت نہیں ہوا کہ عیدِ پنتکُست کے دن جو حواری جمع تھے وہ مسیح کی باتوں کو بھول گئے تھے اور اس روح نے جو ان پر نازل ہوئی انہیں وہ سب باتیں یاد دلائیں۔

(۵) عیسیٰ علیہ السلام فرماتے ہیں کہ "اب میں نے تم سے اس کے ہونے سے پہلے کہہ دیا ہے تاکہ جب وہ وقوع میں آئے تو تم ایمان لاؤ"۔ اس فقرے سے بھی معلوم ہوتا ہے کہ فارقلیط سے مراد یہ روح نہیں ہے۔ اگر نزول روح کی خبر دینا مقصود ہوتا تو مکرر اس تاکید کی کوئی ضرورت ہی نہ تھی، کیونکہ ہم اوپر بیان کر چکے ہیں کہ روح کا نازل ہونا کوئی ایسا امر نہ تھا جس کو حواریین مستبعد سمجھتے، یا ان سے یہ اندیشہ ہوتا کہ نزول روح کے وقت وہ اس سے انکار کر دیں گے۔ پس یہ تاکید کی تکرار صاف بتا رہی ہے کہ فارقلیط سے مراد ایک آنے والا نبی ہے۔

(۶) عیسیٰ علیہ السلام نے پھر فرمایا کہ "وہ میری گواہی دے گا"۔ مگر اس روح نے مسیح کے تلامذہ میں سے کسی کے سامنے مسیح کی گواہی نہ دی، نہ اس گواہی کی کوئی ضرورت تھی، کیونکہ جن حواریوں پر وہ نازل ہوئی تھی وہ اس کے نزول سے پہلے ہی مسیح کو جانتے تھے اور کسی شہادت کے محتاج نہ تھے۔ رہے کفّار جنہوں نے مسیح کا انکار کیا تھا، تو وہ شہادت کے تو محتاج ضرور تھے، مگر یہ روح نہ ان پر نازل ہوئی نہ اس نے ان کے سامنے کوئی شہادت دی بخلاف اس کے محمد صلی اللہ علیہ وسلم نے مسیح علیہ السلام کی صداقت پر گواہی دی، ان کی والدۂ ماجدہ پر کفار نے زنا کی جو تہمت لگائی تھی اس کو نہایت پرزور طریقہ سے رد کیا اور تمام انبیا علیہم السلام کے ساتھ مسیح علیہ السلام پر بھی ایمان لانے کو لازم گردانا۔

(۷) عیسیٰ علیہ السلام اس کے بعد فرماتے ہیں "اور تم بھی گواہی دو گے[1] کیونکہ تم شروع

[1] بعض اردو ترجموں میں "تم بھی گواہ ہو" لکھا ہے، مگر انگریزی ترجمہ جو زیادہ مستند سمجھا جاتا ہے، یوں ہے And ye also (shall bear witness عربی کے جدید ترین ترجمہ کے الفاظ یہ ہیں۔ وتشھدون انتم ایضاً۔

سے میرے ساتھ ہو۔" اس قول سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ جب آنے والا فارقلیط مسیح پر گواہی دیگا تو مسیح کے سچے پیرو بھی اس کے ساتھ گواہی دیں گے لیکن اگر فارقلیط سے مراد وہ روح لی جائے جو حواریوں پر نازل ہوئی تھی تو یہ قول بے معنی ہو جاتا ہے۔ اس روح کے نزول کی کیفیت جو کتاب الاعمال میں بیان ہوئی ہے وہ یہ ہے کہ وہ ایک آندھی کے سے سناٹے کے ساتھ آئی اور زبان ہائے آتش کی شکل میں ظاہر ہوئی اور ہر ایک حواری پر آ ٹھیری اور وہ سب اس روح سے بھر گئے۔ اس بیان سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ وہ روح ان میں اس طرح حلول کر گئی تھی جس طرح جن کسی کے اندر اتر جاتا ہے۔ اب اگر وہ مسیح پر گواہی دیتی بھی تو اس کی گواہی اور حواریوں کی گواہی جدا جدا نہ ہوتی بلکہ وہ صرف روح ہی کی گواہی ہوتی۔

(۸) عیسیٰ علیہ السلام پھر فرماتے ہیں "اگر میں نہ جاؤں تو وہ فارقلیط تمہارے پاس نہ آئے گا لیکن اگر میں جاؤں گا تو اسے تمہارے پاس بھیجدوں گا۔" یہاں آنجناب نے فارقلیط کی آمد کے لیے اپنے جانے کو شرط، اور موجودگی کو اس کی آمد کے لیے مانع قرار دیا ہے۔ مگر نزول روح کے لیے تو نہ مسیح کی موجودگی مانع تھی اور نہ مسیح کے جانے پر اس کی آمد موقوف تھی، کیونکہ وہ مسیح کے عہد میں بھی حواریوں پر نازل ہو چکی تھی (جبکہ مسیح نے انہیں بلاد اسرائیلیہ کی طرف بھیجا تھا) لہذا فارقلیط سے روح مراد نہیں ہو سکتی، بلکہ وہ کوئی ایسا ہی شخص ہو سکتا ہے جس سے مسیح کی زندگی میں ان کے پیرو فیضیاب نہ ہوئے ہوں اور جن کا آنا مسیح کے جانے پر موقوف ہو۔ چونکہ دو مستقل صاحب شریعت نبیوں کا بیک وقت موجود ہونا جائز نہیں ہے، اور اسی بنا پر حضرت مسیح علیہ السلام نے فرمایا تھا کہ اگر میں نہ جاؤں گا تو وہ نہ آئے گا، اس لیے وہ لامحالہ کوئی نبی ہی ہونا چاہیے۔

(۹) عیسیٰ علیہ السلام آگے چل کر فرماتے ہیں "وہ دنیا کو قصوروار ٹھیرائیگا۔" اس مفہوم کے لیے عربی ترجمہ میں "یوبخ العالم" اور "یبکت العالم" کے الفاظ استعمال کیے گئے ہیں جس کے معنی زجر اور ملامت

کرنے اور حجت کے زور سے غالب آنے کے ہیں۔ انگریزی میں Reprove کا لفظ استعمال کیا گیا ہے، جس کے معنی سرزنش کرنے اور ڈانٹنے کے ہیں! اب یہ کھلی ہوئی تاریخی حقیقت ہے کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم سے بڑھ کر کسی نے ان لوگوں کو سرزنش اور زجر و توبیخ نہیں کی ہے جنھوں نے مسیح کی تکذیب کی اور انکی والدہ پر تہمت لگائی، اور ان پر قتل کا فتوی صادر کیا۔ یہ بات نہ اس روح پر صادق آتی ہے جو شاگردوں پر نازل ہوئی تھی اور نہ بعد کے کسی مسیحی پر۔

(۱۰) حضرت عیسیٰؑ یہ بھی فرماتے ہیں کہ "اس جہان کا سردار آتا ہے اور مجھ میں اس کی کوئی چیز نہیں ہے"۔ اس فقرہ میں فارقلیط کی دو مزید صفات بیان کی گئی ہیں۔ ایک یہ کہ وہ اس جہان کا سردار (رئیس ھذا العالم۔ Prince of this world) ہے دوسرے یہ کہ وہ حضرت عیسیٰؑ پر فضیلت رکھتا ہے، کیونکہ حضرت اس کے مقابلہ میں اپنی بے بضاعتی کا اظہار اس طرح کرتے ہیں کہ "مجھ میں اس کی کوئی چیز نہیں" (بعض ترجموں میں ہے "مجھ میں اس کا کچھ نہیں") یہ دونوں باتیں اس بات پر دلالت کرتی ہیں کہ وہ آنے والا مسیح کے ساتھ متحد الحقیقت نہیں ہے، بلکہ غیر ہے، آسمان کا نہیں بلکہ اس جہاں کا سردار ہے، اور مسیح کے مقابلہ میں افضل ہے روح القدس ان صفات کی حامل نہیں ہو سکتی۔ ایک انسان ہی ان کا مصداق ہو سکتا ہے۔

(۱۱) پھر مسیح فرماتے ہیں کہ "مجھے تم سے بہت سی باتیں کہنی ہیں مگر ابھی تم ان کے تحمل کی تاب نہیں رکھتے" یہ فقرہ بھی اس بات پر دلالت کرتا ہے کہ آنے والے سے وہ روح مراد نہیں ہے جو شاگردوں پر نازل ہوئی تھی، کیونکہ اس نے حضرت عیسیٰ کے احکام پر کسی حکم کا اضافہ نہیں کیا۔ عیسائیوں کے اپنے بیان کے بموجب اس نے مسیحیوں کو صرف عقیدۂ تثلیث کی تعلیم دی اور انہیں حکم دیا کہ دنیا کو اس عقیدہ کی طرف دعوت دیں۔ اس میں کونسی ایسی بات ہے جو اس تعلیم پر زائد ہو جو حضرت عیسیٰ خود عیسائیوں کے اعتقاد کے بموجب صلیب پر چڑھنے کے وقت تک دیتے رہے؟ ہاں یہ ضرور ہوا کہ انہوں نے اس روح کے نزول کے بعد توراۃ کے احکام عشرہ میں سے

چند کے سوا باقی تمام احکام کو ساقط کر دیا اور بہت سے محرّمات کو حلال کر لیا۔ مگر یہ کوئی ایسی بات نہیں جس کے متعلق حضرت مسیح کو یہ کہنے کی ضرورت پیش آتی کہ تم اس کے تحمل کی قوت نہیں رکھتے احکام کا اسقاط تو کوئی بار نہیں بلکہ پچھلے بار کو ہلکا کرنے والی چیز ہے، پھر اس کے لیے تحمل کی قوت نہ ہونے کے کیا معنی؟ البتہ مزید احکام کو قبول کرنا ضرور قوتِ تحمل چاہتا ہے، اور یہ ظاہر ہے کہ مسیح علیہ السلام کے زمانہ نبوت میں عیسائی اس قدر ضعیف الایمان اور کمزور تھے کہ وہ فرائض اور واجبات اور اوامر و نواہی اور جہاد و قتال اور سیاست مدن کے عظیم الشان بار کو نہیں سنبھال سکتے تھے۔ انہی چیزوں کے متعلق حضرت مسیح نے فرمایا کہ مجھے تم سے بہت سی باتیں کہنی تھیں، مگر اس وقت تم ان کو برداشت کرنے کی قوت نہیں رکھتے، اس لیے میں انہیں ملتوی کرتا ہوں میرے بعد فارقلیط، اس جہان کا سردار، مجھ سے افضل شخص آ کر تمہیں ان کی تعلیم دے گا۔ اب جو کوئی محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرت اور آپ کی شریعت پر غور کرے گا۔ اس کا دل خود گواہی دیگا کہ آپ ہی نے اس کام کو مکمل کیا جسے حضرت عیسیٰ ناقص چھوڑ گئے تھے۔ اور آپ ہی اس بشارت کے مصداق ہو سکتے ہیں۔

(۱۲) پھر حضرت فرماتے ہیں "وہ اپنی طرف سے نہ کہے گا"۔ یہ کلام اس بات پر دلالت کرتا ہے کہ حضرت عیسیٰ کو بنی اسرائیل سے اندیشہ تھا کہ وہ آنے والے نبی کی تکذیب کریں گے، اس لیے پھر ایک مرتبہ انہیں یقین دلانے کی ضرورت پیش آئی کہ وہ شخص نبی صادق ہوگا، اپنی ہوائے نفس کی بنا پر کچھ نہ کہے گا بلکہ جو کچھ اس پر وحی کیا جائے گا وہی تم تک پہنچا دے گا۔ مزید براں اس سے یہ بھی ثابت ہوتا ہے کہ اس سے مراد روح القدس نہیں ہے کیونکہ مسیحی اعتقاد کے بموجب وہ تو اللہ کے ساتھ عینیت رکھتی ہے، پھر اس کے حق میں یہ کہنے کا کونسا موقع تھا کہ وہ جو کچھ سنے گی وہی کہے گی۔ پس لامحالہ اس کے مصداق محمد صلی اللہ علیہ وسلم ہی ہیں کیونکہ آپ انسان ہیں، عین اللہ

نہیں ہیں اور آپ ہی کے حق میں اس اندیشہ کے متعدد وجوہ تھے کہ بنی اسرائیل آپ کی تکذیب کریں گے، اور بعد کے واقعات نے بھی ثابت کر دیا کہ بنی اسرائیل نے نہایت شدت کے ساتھ آپ کی تکذیب کی۔

(۱۳) آخر میں حضرت یہ بھی فرماتے ہیں کہ "جو کچھ میرے پاس ہے وہ اسی سے لے گا" یہ بات بھی روح القدس پر صادق نہیں آتی، کیونکہ اہل تثلیث کے نزدیک تو وہ قدیم ہے، غیر مخلوق ہے، قادر مطلق ہے، اس کے لیے کوئی کمال منتظر نہیں ہے، بلکہ ہر کمال اس کو بالفعل حاصل ہے۔ پس ضرور ہے کہ یہ موعود کسی ایسی جنس سے ہو جو بالذات عالم نہ ہو، بلکہ اس کا علم معطی حق کی عطا کا نتیجہ ہو۔ ایسا شخص صرف ایک بشر رسول ہی ہو سکتا ہے۔ پھر چونکہ اس وہم کا موقع تھا کہ آنے والا نبی حضرت عیسیٰ کی شریعت کا تبع ہوگا، اسلیے حضرت نے اس کو دفع کرنے کے لیے فرمایا کہ "سب چیزیں جو باپ کی ہیں وہ میری ہیں اس لیے میں نے کہا کہ جو کچھ میرے پاس ہے وہ اسی سے لے گا" مطلب یہ ہے کہ تمام تعلیم حق خدا کی طرف سے ہے میرے پاس جو کچھ ہے وہ بھی خدا کا ہے، اور آنے والا نبی بھی جو کچھ کہے گا وہ خدا کی طرف سے کہے گا۔ لہٰذا تم یہ نہ سمجھ لینا کہ اس کی تعلیم میری تعلیم سے کچھ مغائر ہے۔ بلکہ اس کو اپنی ہی چیز سمجھنا۔

بشارت مذکورۃ الصدر کی اس توضیح کو دیکھیے۔ اگر کوئی شخص انکار پر اصرار کرنے والی ذہنیت نہ رکھتا ہو، اور کھلے دل سے بشارت کے صریح مفہوم کو سیدھے سادھے طریق پر سمجھنے کی کوشش کرے، تو بشارت کے الفاظ اور تاریخ کے مسلم واقعات اس کو یقین دلا دیں گے کہ وہ بشارت ایک آنے والے نبی ہی کے لیے تھی اور مسیح کے بعد سے آج تک کوئی ایسی عظیم الشان شخصیت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے سوا پیدا نہیں ہوئی جو اس بشارت کی مصداق ہو۔

**مسیحی علماء کے شبہات** اب ان شبہات پر بھی ایک نظر ڈالیے جو ہماری اس تعبیر پر مسیحی علماء کی طرف

سے وارد کیے گئے ہیں۔

(۱) اس عبارت میں فارقلیط کی تفسیر روح القدس اور روح حق سے کی گئی ہے اور یہ دو
دونوں لفظ اقنوم ثالث کے لیے مختص ہیں۔ پھر فارقلیط سے محمد صلی اللہ علیہ وسلم کیوں کر مراد ہو سکتے ہیں

اس کا جواب یہ ہے کہ عہد قدیم اور عہد جدید میں روح القدس اور روح الحق اور
روح الصدق کے الفاظ جہاں کہیں استعمال ہوئے ہیں ان سے مراد لازماً اقنوم ثالث ہی
نہیں ہے، بلکہ بکثرت مقامات پر ان کو اقنوم ثالث کے سوا دوسرے معانی کے لیے استعمال کیا
گیا ہے مثلاً کتاب حزقیال باب ۳۷ کی آیت ۱۴ میں اللہ تعالیٰ ان ہزاروں آدمیوں کو
جنہیں اس نے حزقیال علیہ السلام کے معجزہ سے زندہ کیا تھا، خطاب کر کے فرماتا ہے "اور
میں اپنی روح تمہارے اندر ڈالوں گا"۔ یہاں روح اللہ سے مراد نفس ناطقہ انسانیہ ہے
نہ کہ اقنوم ثالث جو اہل تثلیث کے نزدیک عین اللہ ہے۔ یوحنا کے پہلے خط کا چوتھا باب ان
الفاظ سے شروع ہوتا ہے۔

"اے عزیزو ہر ایک روح کا یقین نہ کرو بلکہ روحوں کو آزماؤ کہ وہ اللہ کی طرف سے
ہیں یا نہیں، کیونکہ بہت سے جھوٹے نبی دنیا میں نکل کھڑے ہوئے ہیں۔ خدا کی روح
کو تم اس طرح پہچان سکتے ہو کہ جو کوئی روح اقرار کرے کہ یسوع مسیح مجسم ہو کر آیا ہے
وہ خدا کی طرف سے ہے ۔ ۔ ۔ ۔ ہم خدا سے ہیں جو خدا کو جانتا ہے وہ ہماری سنتا ہے
اور جو خدا سے نہیں وہ ہماری نہیں سنتا۔ اسی سے ہم حق کی روح کو پہچان لیتے ہیں"
(آیت ۱ - ۶)۔

ان آیات میں بھی روح اللہ اور روح حق سے مراد اقنوم ثالث نہیں ہے
بلکہ یہاں اس سے مراد واعظ حق ہے، اور مجرد روح بمعنی واعظ اور داعی استعمال کی گئی ہے

جو اگر گمراہی کی طرف بلائے تو گمراہی کی روح کہی جائے گی۔ پس فارقلیط کی تفسیر میں روح القدس اور روح الحق کے الفاظ استعمال کرنے سے لازم نہیں آتا کہ اس سے مراد وہ روح القدس ہو جس کو مسیحی عقیدہ میں اقنوم ثالث کہا جاتا ہے۔ بلکہ بشارت کے دوسرے الفاظ اور قرائن صاف بتا رہے ہیں کہ اس سے مراد واعظ حق اور داعی صدق ہے۔

(۲) اس عبارت میں مسیح کا خطاب حواریوں سے ہے اور ہر جگہ ضمیر مخاطب استعمال کی گئی ہے۔ لہٰذا ضرور ہے کہ فارقلیط حواریوں ہی کے سامنے ظاہر ہو، نہ کہ پانچ چھ سو سال بعد

**جواب** اس کے معنی یہ ہیں کہ جب کبھی ضمیر خطاب استعمال کی جائے تو لازماً موجود الوقت حاضرین یا ہم عصر لوگ ہی اس سے مراد ہوں۔ حالانکہ ہر جگہ ایسا ہونا ضروری نہیں۔ مثال کے طور پر انجیل متی باب ۲۶۔ آیت ۶۴ میں جناب مسیح علیہ السلام سردار کاہنوں اور شیوخ اور عوام کو خطاب کرکے کہتے ہیں:۔

"میں تم سے کہتا ہوں کہ اس کے بعد تم ابن آدم کو قادر مطلق کے دہنی طرف بیٹھے اور آسمان کے بادلوں پر آتے دیکھو گے"۔

اس قول کے مخاطب مر چکے۔ ایک ہزار نو سو برس سے زیادہ زمانہ گذر گیا۔ مگر ابھی تک ابن آدم قادر مطلق کے دہنی طرف بیٹھا ہوا اور آسمان کے بادلوں پر آتا ہوا نظر نہ آیا۔ اگر اس قول کے مخاطب صرف وہی لوگ تھے جو اس مجمع میں موجود تھے، تو مسیح کا یہ قول جھوٹا ثابت ہوتا ہے۔

(۳) فارقلیط کے متعلق مسیح نے کہا ہے کہ وہ روح حق ہے جسے دنیا نہیں پا سکتی کیونکہ وہ اُسے نہ دیکھتی ہے نہ جانتی ہے، لیکن تم اسے جانتے ہو کیونکہ وہ تمہارے ساتھ رہے اور تم میں ہو گی"۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ اس سے مراد روح ہی ہے نہ کہ ایک مجسم انسان جسے دنیا نے

دیکھا بھی اور جانا بھی۔

**جواب** یہ اعتراض اگر ضد کی بنا پر نہیں ہے، تو اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ معترضین کسی بلیغ اور حکیمانہ کلام کے مغز کو سمجھنے کی اہلیت ہی نہیں رکھتے۔ رویت اور معرفت کے دو مرتبے ہوتے ہیں۔ ایک رویت و معرفت تو یہ ہے کہ آپ نے معلم کے جسد اور رنگ و روپ کو دیکھا اور یہ جان لیا کہ وہ ایک خاص شکل و صورت اور صفات رکھنے والا انسان ہے دوسری رویت و معرفت یہ ہے کہ آپ نے اس روح کو دیکھا اور جانا جو اس کی تعلیم اور اس کی سیرت میں پوشیدہ ہے مسیح کی مراد دراصل یہ دوسری نوع ہی کی رویت و معرفت ہے، اسی لیے انہوں نے یہاں شخص کے بجائے "روح حق" کا لفظ استعمال کیا ہے۔ اگر رویت سے مراد رویت بصری اور معرفت سے مراد معرفت جسدی ہو تو ظاہر ہے کہ روح اس اعتبار سے نہ تو مرئی ہے اور نہ قابل معرفت۔ لہذا روح کے لیے اس معنی میں دیکھنے اور جاننے کے الفاظ استعمال کرنا ہی سرے سے بے معنی ہوتا۔ پس مسیح کے کلام کا واضح مقصود یہ ہے کہ فارقلیط میں حق اور صداقت کی جو روح ہوگی، دنیا کے لیے اس کو پانا مشکل ہوگا۔ مگر جو سچے مسیحی ہیں وہ آسانی کے ساتھ اسے پالیں گے۔ یہ وہی بات ہے جو قرآن مجید میں سچے عیسائیوں کے متعلق ارشاد ہوئی ہے۔

وَلَتَجِدَنَّ أَقْرَبَهُمْ مَّوَدَّةً لِّلَّذِينَ آمَنُوا الَّذِينَ قَالُوا إِنَّا نَصَارَىٰ ذَٰلِكَ بِأَنَّ مِنْهُمْ قِسِّيسِينَ وَرُهْبَانًا وَأَنَّهُمْ لَا يَسْتَكْبِرُونَ ۔ وَإِذَا سَمِعُوا مَا أُنزِلَ إِلَى الرَّسُولِ تَرَىٰ أَعْيُنَهُمْ تَفِيضُ مِنَ

اور تم ایمان لانے والوں کے ساتھ محبت کرنے میں سب سے زیادہ جن کو قریب پاؤگے وہ لوگ ہیں جنہوں نے کہا کہ ہم نصاریٰ ہیں۔ یہ اس لیے کہ ان میں قسیس اور راہب ہیں اور وہ سرکشی نہیں کرتے۔ انہوں نے جب وہ پیغام سنا جو

الدَّمْعِ مِمَّا عَرَفُوْا مِنَ الْحَقِّ يَقُوْلُوْنَ رَبَّنَآ اٰمَنَّا فَاكْتُبْنَا مَعَ الشّٰهِدِيْنَ وَ مَا لَنَا لَا نُؤْمِنُ بِاللّٰهِ وَمَا جَآءَنَا مِنَ الْحَقِّ وَنَطْمَعُ اَنْ يُّدْخِلَنَا رَبُّنَا مَعَ الْقَوْمِ الصّٰلِحِيْنَ ( الانعام: ۱۱ ) ۔

رسول پر اتارا گیا ہے تو تم نے دیکھا کہ ان کی آنکھوں سے آنسو جاری ہو گئے کیوں کہ انہوں نے حق کو پہچان لیا۔ وہ کہنے لگے کہ اے ہمارے پروردگار ہم ایمان لائے پس ہمارا نام گواہی دینے والوں میں لکھ لے۔ اور کیا ہم کو جنون ہو گیا ہے کہ ہم اللہ پر اور اس حق پر جو ہمارے سامنے آیا ہے ایمان نہ لائیں اور پھر یہ بھی امید رکھیں کہ ہمارا پروردگار ہم کو صالح لوگوں میں داخل کرے گا۔

اس آیت میں قرآن مجید نے مسیح کے اس قول کی حرف بحرف تائید کی ہے کہ دوسرے لوگوں کی بہ نسبت سچے عیسائی روح حق کو جلدی پہچان لیں گے، کیونکہ وہ پہلے سے حق آشنا اور حق شناس ہو چکے تھے۔

تاہم اگر کوئی مسیحی رویت کے معنی کو رویت بصری اور معرفت کے معنی کو معرفت جسدی ہی میں محصور کرنے پر اصرار کرے تو ہم اس سے انجیل کی حسب ذیل آیات کے معنی دریافت کریں گے:۔

"میں ان سے تمثیلوں میں اس لیے باتیں کرتا ہوں کہ دیکھتے ہیں اور پھر نہیں دیکھتے اور سنتے ہیں اور پھر نہیں سنتے اور نہیں سمجھتے"۔ (متی۔ باب ۱۳۔ آیت ۱۳۔)

"اور کوئی بیٹے کو نہیں جانتا سوا باپ کے اور کوئی باپ کو نہیں جانتا سوا بیٹے کے اور اس کے جس پر بیٹا اسے ظاہر کرنا چاہیے"۔ (متی۔ باب ۱۱۔ آیت ۲۷)

"تم مجھے بھی جانتے ہو اور یہ بھی جانتے ہو کہ میں کہاں کا ہوں (یوحنا۔ باب ۷، آیت ۲۸)

"نہ تم مجھے جانتے ہو نہ میرے باپ کو۔ اگر مجھے جانتے تو میرے باپ کو بھی جانتے۔ (یوحنا

باب ۸ - آیت ۱۹) -

اگر دیکھنے اور جاننے کے مدارج میں تفاوت نہیں ہے، تو آپ اس گورکھ دھندے کو کیونکر سلجھائیں گے کہ ایک ہی وقت میں دیکھنے اور جاننے کی نفی بھی ہے اور اثبات بھی۔

(۴) کتاب الاعمال کے پہلے باب میں ہے: "اور ان سے مل کر ان کو حکم دیا کہ یروشلم سے باہر نہ جاؤ - بلکہ باپ کے اس وعدے کے پورا ہونے کے منتظر رہو جس کا ذکر تم مجھ سے سن چکے ہو کیونکہ یوحنا نے تو پانی سے بپتسمہ دیا مگر تم تھوڑے دنوں کے بعد روح القدس سے بپتسمہ پاؤ گے" (آیت ۵)

یہ قول دلالت کرتا ہے کہ فارقلیط وہی روح ہے جو عید پنتکست کے دن نازل ہوئی، کیونکہ باپ کے وعدے سے مراد فارقلیط ہی ہے۔

**جواب** - یہ کہنا کہ باپ کے وعدے سے مراد فارقلیط ہے اور فارقلیط سے مراد روح القدس ہے، یہ محض ایک ادعا ہی ادعا ہے، اور ہم اس کو بدلائل غلط ثابت کر چکے ہیں دراصل فارقلیط کی بشارت ایک الگ چیز ہے اور شاگردوں پر نزول روح کا وعدہ ایک دوسری چیز ہے۔ دونوں وعدے الگ الگ پورے کیے گئے - یوحنا نے صرف فارقلیط کی بشارت نقل کی ہے، دوسرے انجیلیوں نے اس کا ذکر تک نہیں کیا - لوقا نے نزول روح کا وعدہ نقل کیا ہے - یوحنا نے اس کی طرف اشارہ بھی نہیں کیا - مولفین اناجیل کا حال یہ ہے کہ چھوٹے چھوٹے واقعات کو تو سب کے سب بالاتفاق نقل کرتے ہیں، مثلاً یروشلم جاتے وقت حضرت عیسیٰ کا گدھے پر سوار ہونا، مگر بڑے اہم معاملات کے بیان میں اکثر اختلاف کرتے ہیں حتیٰ کہ کسی بڑے معاملہ کا ایک شخص ذکر کرتا ہے - اور دوسرا بالکل نہیں کرتا - ابن الارملا کو مُردوں میں سے جلا اٹھانا، ستر شاگردوں کو روانہ کرنا، برص کے دس مریضوں کو چنگا کرنا، صرف لوقا کے ہاں مذکور ہے، دوسرے انجیلی مصنفین نے ان واقعات کا کوئی ذکر نہیں کیا، حالانکہ یہ اہم

واقعات ہیں۔ قانائے گلیل کی شادی میں شرکت، اور وہاں پانی کو مئے بنا دینا صرف یوحنّا کے ہاں بیان ہوا ہے، باقی سب اس باب میں خاموش ہیں، حالانکہ یہ وہ واقعہ ہے جس میں پہلی مرتبہ مسیح سے ایک معجزہ صادر ہوا اور ان کی بزرگی کو جان کر لوگوں نے ان پر ایمان لانا شروع کیا۔ اسی طرح بیت صیدا میں ایک ۳۸ سال کے مریض کو چنگا کرنے کا واقعہ، اور ایک زناکار عورت کا قصہ اور ایک جنم کے اندھے کو اچھا کرنے کا حال بھی صرف یوحنّا نے لکھا ہے۔ حالانکہ یہ بھی اہم واقعات ہیں۔ یہی کیفیت متی اور مرقس کی بھی ہے۔ یہ دونوں بھی بعض واقعات کے بیان میں منفرد ہیں۔ پس جو شخص اناجیل میں نظر رکھتا ہے۔ وہ اچھی طرح جانتا ہے کہ نزول روح القدس کی بشارت اور آمد فارقلیط کی بشارت، دونوں ایک نہیں ہیں، بلکہ قطعاً الگ ہیں، اور دونوں کو ایک سمجھنا غلطی ہے۔

## انجیل برنابا اور اس کی بشارتیں

یہاں تک ہم نے وہ بشارتیں نقل کی ہیں جو اہل کتاب کے ہاں قانونی کتابیں تسلیم کی جاتی ہیں۔ اب ہم غیر قانونی کتابوں میں سے ایک اہم کتاب کا ذکر کرتے ہیں جو مسیح کے حواری برنابا (St. Barnabas) کی انجیل کہلاتی ہے۔ یہ ایک قدیم کتاب ہے جس سے ابتدائی زمانہ کے مسیحی خوب واقف تھے۔ اس میں صریح طور پر توحید خالص اور ابطال تثلیث کا ذکر تھا۔ نیز اس میں دین مسیحی کے وہ حقیقی اصول بھی بیان کیے گئے تھے جن کو مٹا کر سینٹ پال نے مسیحیت کی شکل بدل دی۔ مگر بدقسمتی سے پیروان مسیح کا سواد اعظم پال کا متبع ہو گیا، اور اسی کے مذہب نے رومیوں میں فروغ پایا یہاں تک کہ قسطنطین اعظم کے مسیحیت قبول کرنے کے بعد یہی سرکاری مذہب ہو گیا۔

قسطنطین کے عہد میں ایک پادری ایریس (Arius) نامی تھا جس نے یوسیان انطاکی کے مدرسہ میں تعلیم پائی تھی۔ اس کا عقیدہ یہ تھا کہ مسیح خدا نہیں ہے، نہ خدا نے مسیح کے جسم میں

حلول کیا ہے، بلکہ خدا نے اپنی روح مسیح میں پھونک دی تھی۔ اس لحاظ سے وہ ایک ہی خدا کا قائل تھا اور مسیح کو اس کا بندہ سمجھتا تھا۔ سرکاری مذہب کے اکابر نے اس کی سخت مخالفت کی۔ آخر کار ۳۲۵ء میں نیقیہ (Nicaea) کے مقام پر ایک کونسل مقرر کی گئی، جس میں ایک مہینہ سے زیادہ مدت تک اس مسئلہ پر سخت مباحثہ ہوتا رہا قسیسوں کی اکثریت غیر جانبدار رہی۔ مگر قسطنطین کے شاہی اثر سے ایریس اور اس کے پیرووں کو دین سے خارج کر دیا گیا۔ اس مباحثہ میں ایریس نے برنا باکی انجیل کو بھی منجملہ دوسرے شواہد کے، اپنے عقیدہ کی تائید میں پیش کیا تھا۔ سرکاری مذہب کے ائمہ پہلے سے اس انجیل کو ترک کر چکے تھے۔ اب جو ایرین فرقہ نے اس سے استدلال کر کے اپنے مذہب کی تبلیغ شروع کی، تو اس کی مخالفت کا جذبہ اور بڑھ گیا، یہاں تک کہ اس کا مطالعہ حرام قرار دیا گیا، اور اس کے پڑھنے والوں کو سخت سزائیں دی جانے لگیں۔

اس طرح انجیل برنابا قریب قریب دنیا سے ناپید ہو گئی لیکن اس کے چند نسخے پھر بھی موجود رہے۔ قرآن کے مترجم جارج سیل نے اس کا ہسپانوی نسخہ دیکھا تھا۔ اس سے بہت پہلے ایک راہب مرینو نامی نے سولہویں صدی کے اواخر میں اس کا لاطینی نسخہ پاپائے روم کے کتب خانہ میں دیکھا اور وہاں سے چرا لیا۔ بیان کیا جاتا ہے کہ اسی نسخہ کو دیکھ کر مرینو مسلمان ہو گیا۔ ایک اور نسخہ بلاط (ویانا) کے کتب خانہ میں پایا گیا ۱۹۰۷ء میں ایل ریگ (L. Ragg) نے اس کا ترجمہ انگریزی زبان میں آکسفرڈ سے شائع کیا، اور اس نسخہ سے عربی زبان میں اس کا ترجمہ ہوا۔

مسیحی علماء کہتے ہیں کہ یہ انجیل جعلی معلوم ہوتی ہے۔ غالباً کسی ایسے پادری نے ایطالوی زبان میں اس کو تصنیف کیا ہے جو مسیحیت کو چھوڑ کر مسلمان ہو گیا ہو گا لیکن یہ محض ایک قیاس ہے۔ اس کا کوئی ثبوت وہ نہیں دے سکے ہیں۔ بخلاف اس کے یہ امر ثابت ہے کہ ظہور اسلام سے تین سو برس پہلے برنا باکی انجیل ایسی موجود تھی اور اس میں پولوسی عقائد کے خلاف باتیں پائی جاتی تھیں جن کی بنا پر اس کو مستند کتابوں کے زمرہ

خارج کیا گیا۔ سب سے بڑی بات جس سے ثابت ہوتا ہے کہ مسلمانوں کا اس انجیل کے جعل سے کوئی تعلق نہیں ہے گذشتہ بارہ صدیوں میں علمائے اسلام نے مسیحیوں کے رد میں بہت کچھ لکھا اور خود مسیحی کتابوں سے بھی استدلال کیا مگر کسی مسلمان مصنف کی کتاب میں برنابا کی انجیل کا ذکر نہیں پایا گیا۔ یہ ایسی بات ہے جس کو دشمن اسلام مارگولیتھ جیسے شخص نے بھی تسلیم کیا ہے۔ مسیحیوں کو اس کتاب کے جعلی ہونے کا شبہہ زیادہ تر اس وجہ سے ہوا کہ اطالین نسخہ پر کچھ عربی تعلیقات پائی گئی ہیں لیکن جن لوگوں نے ان تعلیقات کو دیکھا ہے وہ جانتے ہیں کہ وہ کسی مسلمان عالم کی نہیں ہو سکتیں، کیونکہ ان کی زبان نہایت ناقص ہے حتی کہ ایک جگہ سبحان اللہ کو اللہ سبحان لکھا ہے۔

اس مختصر تعارف کے بعد ہم اس انجیل کے چند اقتباسات نقل کرتے ہیں:-

" تب شاگرد رونے لگے اور بولے کہ اے استاد تو ہمیں کیوں چھوڑے جاتا ہے۔ ہمارے لیے مرجانا اس سے بہتر ہے کہ تو ہمیں چھوڑے۔ یسوع نے جواب دیا تمہارا دل نہ گھبرائے اور نہ ڈرے[١] کیونکہ وہ میں نہیں ہوں جس نے تمہیں پیدا کیا ہے، بلکہ اللہ ہی نے تمہیں پیدا کیا اور وہی تمہاری حفاظت کرے گا۔ رہا میں تو میں اللہ کے اس رسول کے لیے راستہ صاف کرنے آیا تھا جو دنیا کو نجات دلانے کے لیے قریب میں آنے والا ہے۔ مگر تم ہوشیار رہنا کہ دھوکا نہ کھا جاؤ۔ بہت سے جھوٹے نبی آئیں گے[٢] جو میرا کلام لیں گے اور میری انجیل کو نجس کر دیں گے۔

تب اندریاس بولا اے استاد ہمیں اس کی علامت بتا دے کہ ہم پہچانیں۔

یسوع نے جواب دیا وہ تمہارے زمانہ میں نہ آئے گا بلکہ تمہارے بعد برسوں پیچھے آئیگا۔ جب کہ میری انجیل مٹ جائے گی اور دنیا میں ۳۰ مومن بھی نہ پائے جائیں گے۔ اس وقت اللہ دنیا پر رحم کھائے گا اور اپنے رسول کو بھیجے گا جس کے سر پر سپید عمامہ ہوگا۔ اللہ کے برگزیدہ

[١] یوحنا باب ١٤ - آیت ٢٧ -
[٢] متی باب ٢٤ - آیت ١١ -

بندوں میں سے ایک اس کو پہچانے گا اور اس کو عالم پر ظاہر کرے گا۔ وہ بیدینوں پر بڑی قوت کے ساتھ آئے گا۔ اور عالم سے بتوں کی پرستش مٹا دیگا ۔ میں اِس کو چھپاتا ہوں کیونکہ اِس کا اعلان اُس کے واسطے سے ہوگا، اور وہی خدا کا جلال ظاہر کرے گا اور میری سچائی کھولے گا، اور ان لوگوں سے انتقام لے گا جو مجھے انسان سے برتر کہیں گے ..... وہ تمام انبیاء سے زیادہ روشن حق کے ساتھ آئیگا اور ان لوگوں کو سخت توبیخ کریگا جو اس عالم میں سیدھی راہ نہیں چلتے ..... پس جب بت پرستی کو زمین پر گرتے دیکھا جائے، اور اقرار کیا جائے کہ میں ایک انسان ہوں دوسرے انسانوں جیسا، تو میں تم سے سچ کہتا ہوں کہ اس وقت اللہ کا نبی آئے گا۔ (فصل ۷۲۔ آیت ۷ تا ۲۴)۔

اس کے بعد فصل ۹۶ میں مسیح اور سردار کاہن کی گفتگو نقل کی گئی ہے۔ کاہن نے مسیح سے اس کی بابت پوچھا تو مسیح نے اس کو اپنا اور اپنی ماں کا نام بتایا اور کہا کہ میں بشر ہوں۔ دوسرے بنی آدم کی طرح فانی بشر۔ اس سلسلہ میں لکھا ہے:۔

"کاہن نے جواب میں کہا موسیٰ کی کتاب میں لکھا ہے کہ ہمارا خدا قریب میں ہمارے لیے مسیا کو بھیجے گا جو ہم کو اس بات کی خبر دینے کے لیے آئیگا کہ اللہ کیا چاہتا ہے، اور وہ عالم کے لیے اللہ کی رحمت لے کر آئے گا۔ اس لیے میں چاہتا ہوں کہ تو ہم سے سچ کہدے کہ کیا تو ہی اللہ کا مسیا ہے جس کا ہم انتظار کر رہے تھے؟

یسوع نے جواب دیا، سچ ہے، اللہ نے اس کا وعدہ کیا تھا، مگر میں وہ نہیں ہوں، کیونکہ وہ مجھ سے پہلے پیدا کیا گیا اور میرے بعد آئے گا۔[1]

کاہن نے جواب میں کہا ہم تیرے کلام اور تیری نشانیوں سے یہ سمجھتے ہیں کہ بہرحال تو

---

[1] یوحنا باب ۱۔ آیت ۱۵۔

نبی اور اللہ کا قدوس ہے۔ اسی لیے میں کل یہودیہ اور اسرائیل کے نام پر درخواست کرتا ہوں کہ تو خدا کی محبت میں ہم کو بتادے کہ مسیا کس طرح آئے گا؟

یسوع نے جواب دیا قسم ہے اس خدا کی جس کے حضور میں میری جان حاضر ہے، میں وہ مسیا نہیں ہوں جس کا انتظار تمام قبائل زمین کر رہے ہیں، جس کا وعدہ ہمارے باپ ابراہیم سے خداوند نے اس طرح کیا تھا کہ تیری نسل سے میں کل زمین والوں کو برکت دوں گا۔ مگر جب خداوند مجھ کو اس دنیا سے لے گا، تب شیطان ایک مرتبہ پھر اس فتنے کو بھڑکائے گا اور جو لوگ خدا سے نہیں ڈرتے وہ ان کو یہ کہنے پر آمادہ کرے گا کہ میں خدا ہوں اور خدا کا بیٹا ہوں اس سبب سے میرا کلام اور جو کچھ میں سکھاتا ہوں، نجس ہو جائے گا۔ یہاں تک کہ تیس ایماندار نہ پائے جائیں گے۔ تب اللہ دنیا پر رحم کھائے گا اور اپنے رسول کو بھیجے گا جس کے لیے اس نے سب چیزوں کو پیدا کیا ہے۔ جو قوت کے ساتھ جنوب کی طرف سے آئے گا اور بتوں اور ان کی پوجا کرنے والوں کو نابود کرے گا۔ اور شیطان سے اس کی حکومت جو اس نے آدمی پر قائم کر لی ہے چھین لے گا۔ وہ خداوند کی رحمت کے ساتھ آئے گا خداوند پر ایمان لانے والوں کو رہائی دلائے گا اور جو کوئی اس کے کلام پر ایمان لائے گا مبارک ہوگا (آیت ۳-۱۵)

پھر فصل ۹۷ یوں شروع ہوتی ہے:۔

"حالانکہ میں اس کی جوتیوں کے تسمے کھولنے کے لائق بھی نہیں ہوں، پر میں نے خداوند سے یہ نعمت اور رحمت پائی ہے کہ اسے دیکھوں۔

تب کاہن نے حاکم اور رئیس کے ساتھ مل کر جواب میں کہا کہ اے یسوع اللہ کے قدوس اپنے دل کو پریشان نہ کر کیونکہ یہ فتنہ ہمارے زمانہ میں دوبارہ نہ اٹھے گا کیونکہ ہم ابھی رومیوں کے سرداروں کی مجلس کو لکھتے ہیں کہ فرمان جاری ہو کہ کوئی شخص تجھ کو خداوند اور خداوند کا

بیٹا نہ کہنے پائے۔ تب یسوع بولا کہ تمہارے کلام سے مجھ کو تسلی نہیں ہوتی کیونکہ جدھر سے تم روشنی کی امید رکھتے ہو ادھر ہی سے تاریکی آئے گی۔ مگر مجھ کو تسلی اس سے ہوتی ہے کہ وہ رسول آنے والا ہے جو میرے حق میں ہر جھوٹی رائے کو مٹا دے گا اور اس کا دین پھیل جائے گا اور سارے جہان پر چھا جائیگا کیونکہ خدا وند نے ہمارے باپ ابراہیم سے ایسا ہی وعدہ کیا ہے۔ اور جو بات مجھ کو تسلی دیتی ہے یہ ہے کہ اس کے دین کے لیے انتہا نہیں کیونکہ اللہ اس کو ٹھیک ٹھیک محفوظ رکھے گا

کاہن نے جواب میں کہا کیا دوسرے رسول بھی اللہ کے رسول کے بعد آئیں گے

یسوع جواب دیا اس کے بعد سچے نبی خدا وند کے بھیجے ہوئے نہ آئیں گے۔ مگر بہت سے جھوٹے نبی آئیں گے اور یہی بات ہے جو مجھے رنج دیتی ہے کیونکہ شیطان خدا وند عادل کے حکم سے ان کو بھڑکائے گا پس وہ میری انجیل کے دعوے کو آڑ بنائیں گے[1]

حیدروس نے جواب میں کہا کیسی بات ہے کہ ان کافروں کا آنا خدا وند عادل کے حکم سے ہوگا؟

یسوع نے جواب دیا۔ عدل ہے یہی ہے کہ جو اس کی رحمت کے لیے حق پر ایمان نہ لائے وہ اس کی لعنت کے لیے جھوٹ پر ایمان لائے۔ اس لیے میں تم سے کہتا ہوں کہ دنیا ہمیشہ سچے نبیوں کی تحقیر کرتی رہی اور جھوٹوں سے محبت کرتی رہی جیسا کہ میشع اور ارمیا کے زمانے میں دیکھا گیا کیوں کہ مشابہ اپنے مشابہ ہی کو پسند کرتا ہے۔

تب کاہن بولا مسیا کا نام کیا ہوگا اور وہ کیا علامت ہوگی جس کے ساتھ اس کی آمد کا اعلان ہوگا؟

---

[1] بعید نہیں کہ یہ اشارہ مسیح موعود بننے کی طرف ہو۔ اگر ہمارا یہ قیاس درست ہے تو اس سے ثابت ہوتا ہے کہ ضرور یہ کلام نبی صادق ہی کا ہے کیونکہ ایسے صدیوں پہلے یہ بات کسی کے وہم و گمان میں بھی نہ تھی کہ کوئی مدعی مسیح موعود ہونے کا دعویٰ کریگا۔

"یسوع نے جواب دیا کہ مسیا کا نام عجیب ہے کیونکہ خداوند نے خود ہی اس کا نام رکھا جب اس کو پیدا کیا اور آسمانی شان میں اس کو جگہ دی خداوند کہتا ہے ٹھیر اے محمدؐ کیونکہ تیری خاطر سے میں ارادہ کرتا ہوں کہ جنت کو اور عالم کو اور مخلوقات کے جمِ غفیر کو بناؤں جو سب میں تجھ کو بخش دونگا، حتیٰ کہ جو تجھے مبارک کہیگا وہی مبارک ہوگا اور جو تجھے لعنت کرے گا وہی ملعون ہوگا۔ اور جب میں تجھ کو دنیا میں بھیجوں گا تو تجھے اپنا رسول بناؤں گا تاکہ تو رہائی دلائے اور تیرا کلام صادق ہو، حتیٰ کہ آسمان اور زمین کو زوال آجائے مگر تیرے ایمان کو کبھی زوال نہ آئے۔ اس کا مبارک نام محمدؐ ہے۔

تب سب لوگ پکارنے لگے اے خداوند ہمارے لیے اپنا رسول بھیج۔ اے محمدؐ دنیا کو چھڑانے کے لیے جلدی آ" (آیت ۱-۱۸)۔

ان بشارتوں میں صرف ایک چیز ایسی ہے جس کو دیکھ کر ایک غیر جانب دار آدمی پہلی نظر میں شبہ کرے گا کہ شاید یہ کوئی جعلی کتاب ہے وہ یہ کہ اس میں کتب آسمانی کے عام انداز کے خلاف محمد صلی اللہ علیہ وسلم کا اصلی نام بعینہ موجود ہے لیکن ذرا تامل کرنے سے یہ شبہ بھی رفع ہو جاتا ہے۔ بعید نہیں کہ دراصل مسیح علیہ السلام نے وہی لفظ استعمال کیا ہو جس کا ترجمہ دوسری اناجیل کے مؤلفین نے فارقلیط (Paraclete) کیا ہے۔ برنابا کے مؤلف یا مترجم نے اسی لفظ کا ترجمہ ( Periclite ) کیا اور بعد کے مترجمین نے یہ دیکھ کر کہ اس کا صحیح مفہوم لفظ "محمدؐ" ہے اور اس نام کے مسمیٰ میں وہ تمام صفات بھی پائی گئی ہیں جو مسیح علیہ السلام نے بیان کی ہیں، یہی لفظ استعمال کرنا مناسب سمجھا۔ پس نام کی صراحت اگر پائی جاتی ہے تو ترجمہ میں پائی جاتی ہے۔ اصل انجیل برنابا جس کے تراجم دوسری زبانوں میں ہوئے۔ آج موجود نہیں ہے، کہ اس کو دیکھ کر تحقیق کیا جا سکتا ہو کہ اس میں بھی لفظ محمدؐ استعمال کیا گیا تھا یا اس کا ہم معنی کوئی اور لفظ

# جنایات بر جائداد

## اسلامی قانون ٹارٹ کا ایک اہم شعبہ

از جناب مولوی محمد غوث صاحب ایم۔اے ایل ایل بی (عثمانیہ)

[یہ اس تحقیقی مقالہ کا ایک حصہ ہے جو صاحب مقالہ نے جامعہ عثمانیہ میں پیش کیا تھا]

**الف۔ حق تملک۔ ب۔ حقوق جو بربنا ملکیت حاصل ہوتے ہیں۔ ج۔ حرمت مال غیر۔**

### ۱ الف۔ حق تملک

(۱) يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا لَا تَأْكُلُوا أَمْوَالَكُمْ بَيْنَكُمْ بِالْبَاطِلِ إِلَّا أَنْ تَكُونَ
تِجَارَةً عَنْ تَرَاضٍ مِنْكُمْ وَلَا تَقْتُلُوا أَنْفُسَكُمْ إِنَّ اللَّهَ كَانَ بِكُمْ رَحِيمًا۔ وَمَنْ
يَفْعَلْ ذَٰلِكَ عُدْوَانًا وَظُلْمًا فَسَوْفَ نُصْلِيهِ نَارًا۔ وَكَانَ ذَٰلِكَ عَلَى اللَّهِ
يَسِيرًا۔ إِنْ تَجْتَنِبُوا كَبَائِرَ مَا تُنْهَوْنَ عَنْهُ نُكَفِّرْ عَنْكُمْ سَيِّئَاتِكُمْ وَنُدْخِلْكُمْ
مُدْخَلًا كَرِيمًا۔ وَلَا تَتَمَنَّوْا مَا فَضَّلَ اللَّهُ بِهِ بَعْضَكُمْ عَلَىٰ بَعْضٍ لِلرِّجَالِ
نَصِيبٌ مِمَّا اكْتَسَبُوا وَلِلنِّسَاءِ نَصِيبٌ مِمَّا اكْتَسَبْنَ وَاسْأَلُوا اللَّهَ مِنْ فَضْلِهِ
إِنَّ اللَّهَ كَانَ بِكُلِّ شَيْءٍ عَلِيمًا۔ وَلِكُلٍّ جَعَلْنَا مَوَالِيَ مِمَّا تَرَكَ الْوَالِدَانِ
وَالْأَقْرَبُونَ وَالَّذِينَ عَقَدَتْ أَيْمَانُكُمْ فَآتُوهُمْ نَصِيبَهُمْ إِنَّ اللَّهَ كَانَ عَلَىٰ كُلِّ
شَيْءٍ شَهِيدًا۔[1]

---

[1] سورۃ النساء ۵۔

ان آیات کریمہ کا حسب ذیل ترجمہ ہو سکتا ہے ۔

" اے ایمان والو ۔ ایک دوسرے کے مال آپس میں ناحق خورد برد نہ کیا کرو مگر یہ کہ آپس کی خوشی سے باہمی خرید و فروخت ہو ۔ اور نہ آپس میں خون کرو اللہ کو تم پر رحم ہے ۔ اور جو کوئی یہ کام تعدی اور ظلم سے کرے اس کو ہم آگ میں ڈالیں گے ۔ اور یہ اللہ پر آسان ہے ۔ اگر تم بری چیزوں سے جو تم کو منع ہوئی ہیں بچتے رہو گے ۔ ہم تم سے تمہاری تقصیریں اتار دیں گے ۔ اور تم کو عزت کے مقام میں داخل کر دیں گے ۔ اور جس چیز میں اللہ نے ایک کو ایک پر بڑائی دی ہے اس کی ہوس مت کرو ۔ مردوں کو حصہ ہے اپنی کمائی سے اور عورتوں کو حصہ ہے اپنی کمائی سے اور اللہ سے اس کا فضل مانگو ۔ اللہ کو ہر چیز معلوم ہے اور ہم نے ہر کسی کے وارث اس مال میں ٹھیرا دئے ہیں جو ماں باپ اور قرابت والے چھوڑ مریں ۔ اور جن سے تم نے معاہدہ کیا ہے ان کو ان کا حصہ پہونچاؤ ۔ ہر چیز اللہ کے روبرو ہے[1]"

قرآن شریف میں اس مقام پر سب سے پہلے حرمت مالِ غیر کا ذکر ہوا ہے ۔ بعد ازاں اسی سلسلہ میں بیان فرمایا ہے کہ ہر مرد اور عورت جو کچھ کمائے وہ اسی کا حق ہے ۔ اس سے حق تملک ثابت ہوگیا ۔ علاوہ براں " اَمْوَالَكُمْ " میں جو ضمیر ہے اس سے بھی حق تملک ثابت ہوتا ہے ۔ اس سے قطع نظر آیات ذیل میں بھی حق تملک تسلیم کر لیا گیا ہے ۔

۱ - اَلَّذِيْنَ يُنْفِقُوْنَ اَمْوَالَهُمْ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ ثُمَّ لَا يُتْبِعُوْنَ مَا اَنْفَقُوْا مَنًّا وَّلَا اَذًى لَّهُمْ اَجْرُهُمْ عِنْدَ رَبِّهِمْ وَلَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُوْنَ[2]

اس آیت کریمہ کے حسب ذیل معنی ہو سکتے ہیں ۔

---

[1] ماخوذ از ترجمہ مولانا شاہ عبد القادر صاحب و مولوی نذیر احمد صاحب ۔ [2] سورۃ البقرہ ع ۳۶ ۔

"جو لوگ اپنے مال اللہ کی راہ میں خرچ کرنے کے بعد نہ تو احسان رکھتے ہیں اور نہ ستاتے ہیں انھیں کو ہے اُن کا ثواب اپنے رب کے پاس اور نہ اُن کو ڈر ہے اور نہ وہ غم کھائیں گے"[۱]

(۲) اَلَّذِیْنَ یُنْفِقُوْنَ اَمْوَالَهُمْ بِالَّیْلِ وَالنَّهَارِ سِرًّا وَّعَلَانِیَةً فَلَهُمْ اَجْرُهُمْ عِنْدَ رَبِّهِمْ وَلَا خَوْفٌ عَلَیْهِمْ وَلَا هُمْ یَحْزَنُوْنَ[۲]

اس آیت شریف کے معنی یہ ہو سکتے ہیں۔

"جو لوگ اپنے مال اللہ کی راہ میں خرچ کرتے ہیں۔ رات اور دن چھپے اور کھلے تو اُن کو ہے ان کا اجر اپنے رب کے پاس"[۳]

(۳) لَتُبْلَوُنَّ فِیْ اَمْوَالِكُمْ وَاَنْفُسِكُمْ[۴]

یعنی "البتہ تم اپنے اموال اور اپنی جانوں میں آزمائے جاؤ گے"[۵]

(۴) وَاٰتُوا الْیَتٰمٰی اَمْوَالَهُمْ وَلَا تَتَبَدَّلُوا الْخَبِیْثَ بِالطَّیِّبِ وَلَا تَاْكُلُوْا اَمْوَالَهُمْ اِلٰی اَمْوَالِكُمْ[۶]

اس آیت کے یہ معنی ہو سکتے ہیں۔

"اور دے ڈالو یتیموں کو ان کے مال اور بدل نہ لو گندا ستھرے سے اور نہ کھاؤ اُن کے مال اپنے مالوں کے ساتھ"[۷]

ان آیات کریمہ میں مال کے ساتھ جو ضمائر استعمال فرمائے ہیں ان سے حق تملک کا صاف پتہ چلتا ہے۔ غرض اس طرح شریعت اسلامی نے دوسرے عام اساسی حقوق[۸] کے ساتھ مال یا جائداد

---

۱؎ ماخوذ از ترجمہ مولانا شاہ عبدالقادر صاحب۔ ۲؎ سورۃ البقرہ ع ۳۸۔ ۳؎ ماخوذ از ترجمہ مولانا شاہ عبدالقادر صاحب
۴؎ آل عمران ع ۱۹۔ ۵؎ مولانا شاہ عبدالقادر صاحب۔ ۶؎ النساء ع ۱۔ ۷؎ شاہ عبدالقادر صاحب
۸؎ مثلاً حریت۔ مساوات عمومی۔ امن عام۔ حفاظت خود اختیاری وغیرہ۔

کے تملک کا حق بھی تسلیم کیا ہے۔

انگریزی قانون نے بھی شخصی حقوق کے ضمن میں حق تملک کو تسلیم کیا ہے[1]۔

حق تملک کے متعین ہونے کے بعد یہ دیکھنا چاہیے۔ کہ اس کی بنا پر کیا حقوق حاصل ہوتے ہیں

## ب۔ حقوق جو بر بنا ملکیت حاصل ہوتے ہیں

انگریزی قانون نے قرار دیا ہے کہ ملکیت کی بنا پر حسب ذیل چار قسم کے حقوق حاصل ہوتے ہیں

۱۔ ملکیت کی بنا پر مالک جائداد زمین یا شئے سے بلا مداخلت غیر انتفاع حاصل کر سکتا ہے۔ مالک مال کو قبضہ میں رکھ سکتا استعمال کر سکتا اور منتقل کر سکتا ہے[2]۔

۲۔ ملکیت کی بنا پر مالک جائداد اس اراضی یا شئے سے جس پر دوسرے شخص کو ملکیت حاصل ہو منتفع حاصل کر سکتا اور اس کو حاصل کر سکتا یا قبضہ میں رکھ سکتا ہے[3]۔

۳۔ ملکیت کی بنا پر دوسرے شخص کے مقابلہ میں ایسا حق حاصل ہو جو صرف اس دوسرے شخص کی ذات تک محدود ہو اور اس حق کی بنا پر دوسرا شخص زمین نقدی یا کوئی اور شئے منتقل کرنے پا بند ہو جائے[4]

۴۔ حق جو کہ صنعت یا ایجاد وغیرہ کی بنا پر بلا مداخلت غیر حاصل ہوتا ہے[5]۔ موضوع مقالہ کے لحاظ سے ہمیں صرف پہلی قسم کے حق سے بحث ہے اس کے متعلق قدرے تفصیل ضروری ہے۔

جائداد چاہے منقول ہو یا غیر منقول مالک جائداد اپنی جائداد میں وسیع یا محدود حد تک ہر قسم کا تصرف کرنے کا مستحق ہے۔ مالک چاہے تو جائداد خود اپنے قبضہ میں رکھ سکتا ہے اور غیر محدود طریقہ سے اُس پر حقوق مالکانہ کا استعمال کر سکتا ہے اور اس سے فائدہ اٹھا سکتا ہے مالک کو آزادی حاصل ہے کہ چاہے تو اپنی جائداد بیع یا ہبہ کر دے بلکہ اس کو اختیار حاصل ہے کہ اگر اپنی خوشی ہو تو زمین اجارہ دے اور مال

[1] آجرس، کامن لا، جلد اول صفحہ ۵ سنہ ۱۹۲۰ء [2] Jus in Rem [3] Jus in Realiena [4] Jus in Personam [5] آجرس۔ کامن لا۔ جلد اول صفحہ سنہ ۱۹۲۰

تلف کر دے۔ اس سے قطع نظر یہ بھی ہوسکتا ہے کہ وہ چند شخص حقوق کے ساتھ کسی مدت مقررہ کے لیے قابض جائداد رہے غیر شخص حقوق کے ساتھ بھی قبضہ حاصل رہ سکتا ہے، یہ غیر شخص حقوق شخص بھی کر دیے جا سکتے ہیں۔ ان حقوق کی نوعیت اس حد تک وسیع ہے کہ کامل حقوق مالکانہ سے ان کا امتیاز مشکل ہی ہوسکتا ہے۔ ان کی نوعیت اس قدر محدود بھی ہوسکتی ہے کہ محض کسی خاص مقصد سے اس کا تعلق ہو۔[1]

شریعت اسلامی میں یہ اصول مسلّم ہے۔ قرآن شریف کی جو آیات کریمہ اس بارے میں نقل کی گئی ہیں ان میں باہمی خرید و فروخت کا جو اشارہ ہے خود اس سے تصرف کا اختیار حاصل ہوا ہے اسلامی فقہا نے طے کیا ہے کہ

"ایسی حالت میں جب کہ کسی غیر کو کوئی منازعت نہ ہو کوئی شخص اپنی مقبوضہ شئے میں تصرف کرنے سے ممنوع نہیں قرار دیا جا سکتا۔"[2]

ملکیت کی جو تعریف اسلامی فقہا نے کی ہے اس میں "جواز تصرف" ہی کو "ملکیت" کی اصلی خصوصیت قرار دیا ہے۔[3]

اس ضمن میں قرار دیا گیا ہے۔ کہ

دریاؤں کے پانی کا استعمال کسی خاص فرد سے مختص نہیں ہے کسی سے اجازت حاصل کرنے کے بغیر ہر شخص پانی پی سکتا ہے! البتہ اگر کسی نے کچھ پانی اپنے برتن میں محفوظ کر لیا ہے تو اس پر اس شخص کو ملکیت حاصل ہو گئی۔ اب اس میں مالک جس طرح چاہے تصرف کرنے کا مجاز ہے بیچ کر دے یا ہبہ اور چاہے تو صدقہ کے طور پر دیدے غرض جس طرح چاہے عمل کرے۔[4]

---

[1] یونائیٹڈ آف ٹارٹس صفحہ ۳۵۲ سنہ ۱۹۲۹ء۔ [2] فصول عمادی مخطوطہ کتب خانہ آصفیہ نمبر (۱۰۱۴) فقہ حنفی عربی فصل (۳۴) فی ما منع الانسان عنہ۔ [3] شرح مجلۃ الاحکام تالیف سلیم بن رستم صفحہ ۵۵ بحوالہ ردالمحتار۔ [4] قواعد زرکشی بحوالہ ابو حامد الاسفرائینی تعلیق صحیح بخاری صفحہ ۳۱۹ از کتاب المساقاۃ۔ باب شرب الناس و الدواب من الانہار مطبوعہ مطبع مصطفائی دہلی سنہ ۱۳۰۵ھ

مالک کو تصرف کا جو اختیار حاصل ہے اس کو امام اعظم نے بڑی وسعت دی ہے۔ جیسا کہ انگریزی قانون میں طے کیا گیا ہے۔[1] امام اعظم نے قرار دیا ہے کہ

"ایسا ہر آزاد شخص جو عاقل اور بالغ ہو اور اقتضائے عقل و شرع کے خلاف اپنے مال کے اتلاف و اسراف پر اتر آئے یعنی "سفیہ" ہو جائے تو اُس کو اپنے مال میں اس قسم کے تصرف سے منع نہیں کیا جائے گا۔ اپنے مال میں اس کا ہر تصرف درست ہے۔ گویہ تصرف بے جا اسراف اور بے فائدہ و خلاف مصلحت اتلاف تک کیوں نہ پہنچ جائے۔ چاہے اپنا مال سمندر میں ڈبو دے۔ پانی میں ڈال دے۔ یا جلا ڈالے۔ جو چاہے کرے"۔[2]

امام شافعی نے قرار دیا ہے۔ کہ بیجا اتلاف اور بے فائدہ اسراف کی صورت میں تصرف سے ممانعت کی جا سکتی ہے۔[3]

لیکن واضح ہو کہ اس ممانعت کی بنا پر مسرف اپنے حقوق تملک سے محروم نہیں ہو جاتا بلکہ اغراض مصالح عامہ اس پر صرف روک پیدا کی جاتی ہے تاکہ سوسائٹی میں بے جا اسراف سے کوئی فساد عام نہ پیدا ہو۔ چنانچہ اپنے مال میں اسراف و اتلاف سے کسی قسم کے ہرجہ کی ذمہ داری عائد نہیں ہوتی ہے۔[4]

اس سلسلہ میں یہ امر بھی پیش نظر رہے کہ اسراف اگر امور خیر میں کیا جاتا ہے مثلاً کوئی شخص اپنی حیثیت سے بڑھکر خیرات کرتا اور کھانا کھلاتا یا کپڑے پہناتا ہے اور اسی طرح دوسرے وجوہ خیر میں اڑاتا ہے تو امام شافعی نے بھی ممانعت ضروری نہیں قرار دی ہے! البتہ حرام امور میں روپیہ لگایا جائے یا مال سمندر میں ڈبو دیا جائے (یعنی خواہ مخواہ ضائع کیا جائے) یا کسی معاملہ میں دھوکہ کا اندیشہ ہو اس صورت میں حکم امتناعی جاری کیا جا سکیگا۔[5]

---

[1] پولک آف ٹارٹس صہ ۳۵۲ سنہ ۱۹۲۹ء۔ [2] الہدایہ صہ ۳۳ جلدین اخیرین کتاب الحجر۔ الجوہرۃ النیرہ صہ ۲۲۵ جلد اول کتاب الحجر۔ [3] المنہاج صہ ۲۵۔ امام محمد اور امام ابو یوسف امام شافعی سے متفق ہیں۔ ہدایہ اخیرین صہ ۳۳۔ [4] القواعد زرکشی۔ تحت "لا" [5] المنہاج صہ ۲۵

## ج ۔ حرمت مالِ غیر

مال پر جو حق تملک حاصل ہے اور اس سے انتفاع کے جو حقوق حاصل ہیں ان کے متعلق یہ امر ہمیشہ واضح رہنا چاہیے کہ ان حقوق سے استفادہ میں قانون نے جو قیود اور شرائط مقرر کی ہیں ان کی پابندی سے کوئی مفر نہیں۔ حق تملک کیساتھ ہی ذمہ داریاں بھی پیدا ہوتی ہیں مالک جائداد پر یہ پابندی عائد ہے کہ اپنی جائداد کو اس طرح استعمال کرے اور قائم رکھے کہ ہمسایوں کے لیے یہ امر تکلیف کا موجب نہ ہو جائے[۱]

اس کے ساتھ ہی تمام افراد کا یہ فرض ہے کہ مالک جائداد کے حقوق کی حرمت قائم رکھیں اور کسی ایسے فعل کا ارتکاب نہ کریں جس سے اُن حقوق میں کوئی مداخلت یا دست اندازی واقع ہو۔ حقوق تملک چاہے وہ اراضی سے متعلق ہوں یا مال سے منشورِ اعظم کے زمانہ سے آج تک برابر قابل حفاظت قرار دیے گئے ہیں[۲]۔ یہ حق جو ہر شخص کو اپنی جائداد کی حفاظت کے متعلق حاصل ہے قطعی حق ہے[۳]۔ بلا قانونی وجہ جواز کے دوسرے شخص کی مملوکہ اراضی یا مال پر کسی طرح ہاتھ نہیں لگایا جا سکتا[۴]۔

اسلامی شریعت نے ابتدا ہی سے حقوق جائداد کی حرمت اور اس کی کامل حفاظت میں کوئی کوتاہی نہیں کی ہے۔ حجۃ الوداع کے یادگار موقع پر شارع علیہ السلام نے جو نہایت اہم خطبہ دیا تھا اس میں یہ بھی فرمایا ہے کہ۔

"ان دماءکم واموالکم واعراضکم حرام علیکم کحرمۃ یومکم ھذا فی بلدکم ھذا فی شھرکم ھذا (متفق علیہ)[۵]"

---

[۱] آجرس کامن لا۔ ص۱۰۱ جلد اول۔ [۲] الف آجرس کامن لا۔ ص۱۰۱ جلد اول۔ ب۔ تاریخ دستور انگلستان ص۹۴ سلسلۂ جامعہ عثمانیہ تالیف۔ ایف۔ سی۔ مانٹیگو۔ [۳] انڈرہل لا آف ٹارٹس۔ ترجمہ بیجناتھ ص۷ سلسلہ جامعہ عثمانیہ م۱۹۲۳ء۔ [۴] پولک ص۱۰ لا آف ٹارٹس ۱۹۲۹ء [۵] مشکوٰۃ باب خطبۃ یوم النحر ص۲۳۲

مطبوعہ صحیح المطابع لکھنؤ ۱۳۵۵ھ

اس بنا پر دوسروں کی جائداد پر ہر قسم کی جنایت قطعاً ممنوع ہے مخفی نہ رہے کہ دوسروں کے مال کا اتلاف، دوسروں کے مال میں دست اندازی، دوسروں کے مال کا حبس بیجا، دوسروں کی زمین پر مداخلت بے جا، ان سب جنایات سے خود قرآن شریف میں ممانعت وارد ہوئی ہے۔

"ایک دوسرے کے مال آپس میں خورد برد نہ کیا کرو"[1]

اس حکم سے اتلاف مال غیر کی ممانعت صراحۃً ثابت ہے مال کا لفظ عام ہے مال منقول اور مال غیر منقول دونوں اس میں شامل ہیں۔ اس حکم سے دوسروں کے مال منقول میں دست اندازی اور مال غیر منقول میں مداخلت بے جا کی ممانعت بھی ثابت ہوتی ہے۔ کیوں کہ اس سے خورد برد کا راستہ کھلتا ہے۔ گویا کہ یہ خورد برد کا مقدمہ ہے اور مقدمہ حرام کا حرام ہوتا ہے۔

اراضی میں مداخلت بے جا کی ممانعت کے متعلق علیحدہ صراحۃً بھی احکام موجود ہیں چنانچہ ارشاد ہوا ہے

"اے ایمان والو اپنے گھروں کے سوا دوسرے گھروں میں گھر والوں سے پوچھے اور سلام کیے بغیر نہ جایا کرو۔ یہ تمہارے حق میں بہتر ہے۔ شائد تم یاد رکھو۔ پھر اگر تم کو معلوم ہو کہ گھر میں کوئی آدمی موجود نہیں تو جب تک تمہیں اجازت نہ ہو ان میں نہ جاؤ اور اگر تم کو کہا جائے کہ واپس جاؤ تو واپس چلے جاؤ اسی میں تمہارے لئے زیادہ ستھرائی ہے۔ اور تم جو کرتے ہو اللہ جانتا ہے۔ غیر آباد مکان جن میں تمہارا اسباب ہو ان میں (بے اجازت) چلے جانے سے تم پر کچھ گناہ نہیں اور جو کچھ تم علانیہ کرتے ہو اور جو کچھ تم چھپا کر کرتے ہو اللہ سب جانتا ہے۔"[2]

اسی طرح مال کے حبس بے جا کی ممانعت کے متعلق حکم ہوا ہے کہ

"اللہ تم کو حکم فرماتا ہے کہ پہنچاؤ امانتیں امانت والوں کو"[3]

بہر حال اسلامی فقہاء نے طے کیا ہے کہ۔

[1] سورۃ النساء رکوع ۵۔ [2] سورۂ نور ع ۴ ترجمہ مولانا شاہ عبدالقادر و مولوی نذیر احمد مرحوم۔ [3] النساء ع ۸

الف "کسی شخص کو یہ جائز نہیں ہے کہ دوسرے کی ملک میں بلا اجازت مالک کوئی تصرف کرے"[1]

ب "کسی دوسرے شخص کے مکان میں بلا اس کی اجازت کے داخل ہونا جائز نہیں ہے"[2]

ج "دوسرے کے مال میں اس کی بلا اجازت کوئی تصرف ناجائز ہے اور بلا اجازت دوسرے کے مال پر کوئی ولایت حاصل نہیں ہے"[3]

د "بلا سبب شرعی دوسرے کے مال کا اخذ کسی کے لیے جائز نہیں ہے"[4]

ھ "دوسرے کے مال میں تصرف کرنے کے لیے کسی کا حکم دینا شرعاً بے اثر ہے"[5]

دوسروں کے مال کی حرمت کا اسلامی شریعت نے جس حد تک لحاظ کیا ہے اس کے متعلق بعض مثالوں کا ذکر بے موقع نہیں ہے۔

۱۔ میت کے دفن کے بعد بلا عذر قبر سے اس کا نکالنا درست نہیں ہے۔ چاہے دفن پر زیادہ عرصہ گذرا ہو یا کم البتہ کسی عذر کی بنا پر میت کو نکالا جا سکتا ہے۔ عذر یہ ہو سکتا ہے کہ زمین کا مغصوب ہونا ظاہر ہو جائے[6]۔

۲۔ کسی غیر کی زمین پر بغیر اجازت مالک کوئی مردہ دفن کر دیا جائے تو مالک کو دو باتوں کا اختیار ہے

الف۔ چاہے تو مردے کو نکالنے پر اصرار کرے۔

ب۔ یا چاہے تو زمین ہموار کرکے اس پر حقوق مالکانہ کا استعمال کرے مثلاً وہ چاہے تو زراعت کر سکتا ہے یہ اس بنا پر کہ سطح کے اوپر اور نیچے مالک کی ملکیت ثابت ہے اور مالک کو اختیار ہے کہ چاہے تو اوپر اور نیچے جو شئے انتفاع حقوق میں هارج ہے اس کو دور کر دے اور یا چاہے تو نیچے جو شئے انتفاع حقوق میں هارج ہے اس کو اس کے حال پر چھوڑ دے اور سطح کے اوپر اپنے حقوق

[1] مادہ ۹۶ مجلۃ الاحکام۔ [2] الدر المختار ص ۱۷۳ جلد ۵ مصر ۱۲۹۹۔ [3] الدر المختار ص ۱۲۳ ج ۴ مصر ۱۲۹۹ ہجری [4] مجلۃ الاحکام مادہ ۹۷۔ [5] مجلۃ الاحکام مادہ ۹۵ [6] فتاویٰ حمادیہ ص ۵۱ و ص ۵۲ المکتبہ

سے منقطع ہونے کا سامان فراہم کرے[1]۔

۳۔ بھوک سے مجبور ہو کر جبکہ مردار بھی حلال ہے کوئی شخص اگر دوسرے کے مال سے اس کی بلا اجازت کچھ کھائے تو ذمہ داری عائد ہو گی اضطرار کی بناء پر دوسرے کا حق بے اثر نہیں ہو جاتا[2]۔

۴۔ ذہاب مال کا خوف ہو تو نماز کا توڑ دینا مباح ہے اس کی صورت یہ ہے کہ ایک شخص نے سواری کا جانور کرایہ پر لیا تاکہ اس پر سواری کر کے کہیں جائے۔ راستہ میں نماز کیلئے ٹھیر گیا اور نماز میں مشغول ہو گیا۔ اس اثنا میں جانور کہیں چلا گیا یا کوئی شخص اس کو لے بھاگنے پر اتر آیا اگر نماز نہ توڑی جائے تو ذمہ داری عائد ہو گی اور ہرجہ ادا کرنا پڑے گا[3]۔

۵۔ امام کو یہ حق نہیں ہے کہ حق ثابت و معروف کے بغیر کسی کے قبضہ سے کوئی شئے نکال لے[4]

اس ساری بحث سے یہ بات بخوبی ظاہر ہے کہ حرمت مال غیر کے متعلق اسلامی شریعت نے وہ سارے حقوق تسلیم کیے ہیں جو ایک متمدن قوم کو امن کی زندگی بسر کرنے کے لیے ضروری ہیں۔ یہ امر مخفی نہ رہے کہ اپنی ملکیت میں کوئی ایسا تصرف کہ اس سے ہمسایہ کو ضرر فاحش ہو ممنوع ہے[5]۔ اس بنا پر کہ

"مفاسد کو دور کرنا منافع حاصل کرنے سے اولیٰ ہے[6]"

"شریعت میں منہیات کا اعتنا مامورات کے اعتنا سے زیادہ ہے[7]۔"

مختصر یہ کہ حق تملک، حقوق جو بربنائے ملکیت حاصل ہوتے ہیں اور حرمت مال غیر کے متعلق جو اصول انگریزی عصری قانون نے اب طے اور تسلیم کیے ہیں وہ اصول شریعت اسلامیہ میں اس کی ابتداء ہی سے مسلم ہیں۔

---

[1] فتاوای حمادیہ ص۵۲۔ [2] مجلۃ الاحکام مادہ ۳۳۔ [3] الاشباہ والنظائر۔ ملاحظہ ہو اتحاف الابصار تبویب الاشباہ ص۳۰۳ م مصر۔ [4] اتحاف الابصار ص۲۱۹ [5] مجلۃ الاحکام مادہ ۳۰۔ [6] ایضاً ۳۰۔ [7] ایضاً ۳۰۔

# مسلم یونیورسٹی علیگڈھ میں اسلامی تعلیم

اشاعت گذشتہ میں سبیل اشارت اُس مجلس کا تذکرہ کیا گیا تھا جو مسلم یونیورسٹی علیگڈھ میں دینیات اور علوم اسلامیہ کی تعلیم کو ضروریات زمانہ کے مطابق ڈھالنے کے لیے تمہیداً مقرر کی گئی ہے۔ اس سلسلہ میں ہم نے اختصار کے ساتھ یونیورسٹی کی تعلیمی پالیسی پر نقد کرتے ہوئے یہ ظاہر کر دیا تھا کہ اس میں بنیادی نقص کیا ہے، اور حقیقی اصلاح کے لیے نظام تعلیم کس ڈھنگ پر مرتب کرنے کی ضرورت ہے۔ مگر بعد میں ہم نے محسوس کیا کہ محض چند اشارات سے کام نہ چلے گا جس تخیل کو ہم پیش کرنا چاہتے ہیں وہ ہمارے اکثر تعلیمی رہنماؤں کے ذہن سے ابھی بہت دور ہے۔ اس لیے ناگزیر ہے کہ ان کے سامنے پوری تفصیل کے ساتھ موجودہ طرز تعلیم کے اساسی نقائص پیش کیے جائیں اور انھیں بتایا جائے کہ یونیورسٹی کی تعلیم کو حقیقت میں "اسلامی" تعلیم بنانے کی صحیح صورت کیا ہے اس غرض کے لیے ہم نے ایک مفصل بیان مرتب کر کے یونیورسٹی کے رجسٹرار صاحب کی خدمت میں بھیجا ہے تاکہ وہ اسے "مجلس اصلاح تعلیم دینی" کے سامنے پیش کر دیں۔ چونکہ یہ مسئلہ مسلمانوں کے تمام ارباب تعلیم کے لیے لائق غور و فکر ہے، اس لئے ہم اس کو شائع کرنا ضروری سمجھتے ہیں۔

قبل اس کے کہ ناظرین ہمارے اس بیان کو ملاحظہ فرمائیں۔ یونیورسٹی کے موجودہ نصاب دینیات پر ایک نظر ڈال لیں تاکہ ہمارے مقاصد کو سمجھنے میں آسانی ہو۔ نیز ان سوالات کو بھی پیش نظر رکھیں جو اس نصاب کے متعلق بعض ارکان مجلس کی جانب سے بھیجے گئے ہیں۔ (ایڈیٹر)

# نصاب دینیات مسلم یونیورسٹی بابت ۱۹۳۷ء

## ہائی اسکول کے لیے

سنّی دینیات۔ (۱) ابواب قدوری۔ (۲) العقیدۃ الحسنہ۔ (۳) لکچر اسلامی اخلاق۔

شیعہ دینیات۔ (۱) اخبار المعصومین۔ (۲) سورۂ جمعہ، سورۂ لقمان، سورۂ منافقون (ترجمہ مولوی فرمان علی صاحب مع تشریح)۔

## ۲۔ انٹرمیڈیٹ کے لیے

سنّی دینیات۔ (۱) تاریخ آغاز اسلام۔ (۲) فقہ۔ جامع صغیر۔ (۳) اخلاق۔ کتاب الحقوق و کتاب الحیوۃ

شیعہ دینیات۔ (۱) تذکرۃ المعصومین (۲) رسالہ جعفریہ۔ (۳) باب الزکوٰۃ والخمس از جامع عباسی۔

## ۳۔ بی۔ اے۔ اور بی ایس سی کے لیے

سنّی دینیات۔ (۱) فقہ۔ ابواب ہدایہ (نکاح۔ محرمات۔ کفو۔ ولایت۔ طلاق۔ خلع۔ مہر۔ وقف۔ وصیت۔ شفعہ) کتاب الطہارت۔ کتاب الصلوٰۃ (۲) تاریخ القرآن (۳) عقیدۃ الحسنہ (شاہ ولی اللہ صاحب) مع شرح و ایضاح

شیعہ دینیات۔ سراج المبین حصہ اول۔ سوانح عمری حضرت علی۔ عقائد شیخ صدوق۔ فقہ۔ نکاح، تجارت، میراث، طلاق، وقف، ہبہ، شفعہ، وصیت، از جامع عباسی۔

## دینیات کے مخصوص امتحانات

۱۔ دینیات کا تکمیلی نصاب برائے بی۔ اے۔ (جونیر) و بی۔ اے (سینیر)۔

(۱) منیۃ المصلی طلبہ میں عبارت کو روانی کے ساتھ پڑھنے اور اسکا ترجمہ کرنے و اسکی تشریح کرنے کی اچھی استعداد ہونی چاہیے

## ۲۔ بی ٹی آیچ کے لیے

ابتدائی امتحان۔ (۱) القرآن و اصول التفسیر (سورۂ فاتحہ، سورۂ بقرہ، سورۂ آل عمران، فوز الکبیر) (۲) حدیث و اصول حدیث۔ بلوغ المرام، نخبۃ الفکر (۳) فقہ ہدایہ جلد اول تا کتاب الحج (۴) فرائض۔ سراجیہ

آخری امتحان۔ (۱) القرآن (سورۃ النساء تا آخر سورۃ البراءۃ)۔ (۲) حدیث۔ تجرید البخاری (۳) فقہ۔ ہدایہ۔ (از کتاب النکاح تا آخر باستثنار نکاح الرقیق وکتاب العتاق) (۴) اصول فقہ۔ منار۔

امیدوار کو مجمع عام میں خطبہ بھی دینا ہوگا اگر ممتحنین اس کی ضرورت سمجھیں۔

## ۳۔ ایم ڈی آیچ کے لیے

(۱) القرآن (از سورۂ یونس تا آخر سورۂ احقاف) (۲) تفسیر۔ تفسیر مظہری (سورۂ بقرو آل عمران) تفسیر کشاف (جز، ۲۶ تا ۳۰ مع سورۂ فاتحہ) (۳) حدیث جامع ترمذی۔ (۴) اصول حدیث۔ مقدمہ ابن صلاح۔ (۵) فقہ۔ ہدایہ آخرین۔ (باستثنار کتاب المکاتب۔ کتاب الولار۔ کتاب الماذون۔ کتاب الجنایات۔ کتاب المعاقل۔ کتاب الخنثیٰ۔ کتاب الدیات)۔ (۶) اصول فقہ۔ ارشاد الفحول۔ (۷) عقائد۔ شرح عقائد نسفی۔ الحجۃ اللہ البالغہ (جزاول)۔

برائے مطالعہ۔ تفسیر مفتی عبدہٗ مصری۔

امیدوار کو مجمع عام میں خطبہ بھی دینا ہوگا۔

## سوالات منجانب ارکان مجلس اصلاح تعلیم دینی

مذکورۂ بالا نصاب کے متعلق مجلس کے ارکان میں سے سر محمد یعقوب، ڈاکٹر عبدالجبار خیری اور مولنا عبدالماجد صاحب دریابادی نے جدا جدا چند سوالات مرتب کئے ہیں جنہیں ہندوستان کے علمی اداروں، سربرآوردہ علماء، یونیورسٹی کورٹ کے ارکان اور مسلم اخبارات کے پاس بغرض حصول جوابات بھیجا گیا ہے۔

سوالات مرتبۂ سر محمد یعقوب:-

(۱) مسلم یونیورسٹی میں دینیات کی تعلیم کا موجودہ طریقہ حسب ذیل ہے۔ کیا آپ کے خیال میں

یہ طرز تعلیم قابل اطمینان ہے ؟ ۔

۲۔ مغربی سائنس اور فلسفہ کی تعلیم حاصل کرنے سے طلبہ کے دلوں میں مذہب کی طرف سے جو شکوک اور بے اعتنائی پیدا ہو جاتی ہے، کیا مسلم یونیورسٹی کی موجودہ تعلیم دینیات ان کے رفع کرنے کے واسطے کافی ہے؟

۳۔ اگر موجودہ تعلیم دینیات کافی اور قابل اطمینان نہیں ہے تو آپ کی رائے کے مطابق اس میں کیا اور کس قسم کی تبدیلی ہونی چاہیے ؟

۴۔ مسلم یونیورسٹی اسکول میں دینیات کی تعلیم کس طرح ہونی چاہیے اور کیا مضامین اسکول کے طلبہ کو پڑھانے چاہئیں ؟

(۵) مسلم یونیورسٹی میں داخلہ کے بعد تعلیم دینیات کس زبان میں ہونی چاہیے، انگریزی میں یا اردو میں؟

(۶) کیا آپ کچھ کتابوں کے نام بتا سکتے ہیں جو مسلم یونیورسٹی میں نصاب تعلیم دینیات میں داخل کیجائیں؟

(۷) اگر انگریزی میں دینیات کی تعلیم دینا آپ کی رائے میں مناسب ہو تو اس کے نصاب کے واسطے کتابوں کے مہیا کرنے کے واسطے آپ کی کیا رائے ہے ؟

(۸) کیا آپ کی رائے میں یہ مفید ہوگا کہ علاوہ کتابی تعلیم کے مسلم یونیورسٹی میں اہم مسائل پر جید علماء کے لکچر ہوا کریں؟ کیا آپ کچھ ایسے اشخاص کے نام بتا سکتے ہیں جو اس قسم کے لکچر دے سکیں ؟

(۹) سنی اور شیعہ طلبہ کی تعلیم کہاں تک علٰحدہ علٰحدہ دیجائے اور کس حد پر پہنچنے کے بعد طلبہ کی دینیات کی تعلیم مشترک ہو جائے؟

(۱۰) مسلم یونیورسٹی میں اس وقت دینیات میں ایک ڈگری دیجاتی ہے جس کا نام بی ٹی ایچ ہے۔ اس کا کورس حسب ذیل ہے۔ کیا آپ کی رائے میں اس ڈگری کا قائم رکھنا یونیورسٹی کے واسطے مفید اور ضروری ہے؟ اور اگر ہے تو اس کا موجودہ نصاب تعلیم مناسب ہے یا تبدیلی کی ضرورت ہے؟ اگر تبدیلی کی ضرورت ہے تو کس قسم کی ؟

سوالات مرتبہ ڈاکٹر عبد الجبار خیری :۔

(۱) اسلامک اسپرٹ ( Islamic Spirit ) سے کوئی محدود ( Definite ) مراد ہے جس کی جامعہ میں ضرورت ہے؟ مفہوم معین کیا جائے۔

(۲) اسلام کیا ہے؟ اسلام کا کیا مقصد ہے؟ اسلام کا مقصد کس طرح سے حاصل ہو سکتا ہے؟

سوالات مرتبہ مولانا عبد الماجد صاحب دریا بادی :۔

۱۔ طلبہ کے عقائد پر اصل حملہ مغربی علوم اور مغربی فنون کا ہوتا ہے اور اصلی ضرورت انہی حملوں سے ان کے عقائد اسلامی کے تحفظ کی ہے۔ نصاب تعلیم کو براہ کرم اس نقطہ نظر سے جانچیے اور ارشاد فرمایئے کہ جناب کے خیال میں اس خاص مقصد کے لیے نصاب میں کیا کیا ترمیمات مناسب ہوں گی؟

## بیان منجانب ایڈیٹر ترجمان القرآن

مسلم یونیورسٹی کورٹ اس امر پر تمام مسلمانوں کے شکریہ کا مستحق ہے کہ اس نے اپنے ادارہ کے بنیادی مقصد یعنی مسلمان طلبہ میں حقیقی اسلامی اسپرٹ پیدا کرنے کی طرف توجہ کی، اور اس کو روبعمل لانے کے لیے آپ کی مجلس کا تقرر کیا۔ اس سلسلہ میں جو کاغذات یونیورسٹی کے دفتر سے بھیجے گئے ہیں، ان کو میں نے پورے غور و خوض کے ساتھ دیکھا۔ جہاں تک دینیات اور علوم اسلامیہ کے موجودہ طریق تعلیم کا تعلق ہے اس کے ناقابل اطمینان ہونے میں کوئی شبہ نہیں۔ جو نصاب اس وقت پڑھایا جا رہا ہے وہ یقیناً ناقص ہے۔ لیکن مجلس کے معزز ارکان کی جانب سے جو سوالات مرتب کیے گئے ہیں، ان کے مطالعہ سے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اس وقت مجلس کے پیش نظر صرف ترمیم نصاب کا سوال ہے، اور غالباً یہ سمجھا جا رہا ہے کہ چند کتابوں کو خارج کرکے چند دوسری کتابیں رکھ دینے سے طلبہ میں "اسلامی اسپرٹ" پیدا کی جا سکتی ہے۔ اگر میرا یہ قیاس صحیح ہے تو میں کہوں گا کہ یہ اصلی صورت حال کا بہت ہی نامکمل اندازہ ہے۔

دراصل ہم کو اس سے زیادہ گہرائی میں جا کر یہ دیکھنا چاہیے کہ قرآن، حدیث، فقہ، اور عقائد کی اس تعلیم کے باوجود، جو اس وقت دی جاری ہے، طلبہ میں "حقیقی اسلامی اسپرٹ" پیدا نہ ہونے کی وجہ کیا ہے؟ اگر محض موجودہ نصاب دینیات کا نقص ہی اس کی وجہ ہے تو اس نقص کو دور کر دینا بلاشبہ اس خرابی کو رفع کر دینے کے لیے کافی ہو جائے گا۔ لیکن اگر اس کے اسباب زیادہ وسیع ہیں، اگر آپ کی پوری تعلیمی پالیسی میں کوئی اساسی خرابی موجود ہے، تو اصلاح حال کے لیے محض نصاب دینیات کی ترمیم ہرگز کافی نہ ہوگی۔ اس کے لیے آپ کو اصلاحات کا دائرہ زیادہ وسیع کرنا ہوگا، خواہ وہ کتنا ہی محنت طلب اور مشکلات سے لبریز ہو۔ میں نے اس مسئلہ پر اسی نقطۂ نظر سے غور کیا ہے، اور جن نتائج پر میں پہنچا ہوں انھیں امکانی اختصار کے ساتھ پیش کرتا ہوں۔

میرا یہ بیان تین حصوں پر مشتمل ہوگا۔ پہلے حصہ میں یونیورسٹی کی موجودہ تعلیمی پالیسی پر تنقیدی نظر ڈال کر اس کی اساسی خرابیوں کو واضح کیا جائے گا اور یہ بتایا جائے گا کہ مسلمان قوم کے حقیقی مفاد کے لیے اب ہماری تعلیمی پالیسی کیا ہونی چاہیے۔ دوسرے حصے میں اصلاحی تجاویز پیش کی جائیں گی۔ اور تیسرے حصہ میں ان تجاویز کو عملی جامہ پہنانے کی تدابیر سے بحث کی جائے گی۔

(۱)

اس وقت مسلم یونیورسٹی میں جو طریق تعلیم رائج ہے وہ تعلیم جدید اور اسلامی تعلیم کی ایک ایسی آمیزش پر مشتمل ہے جس میں کوئی امتزاج اور کوئی ہم آہنگی نہیں۔ دو بالکل متضاد اور بے جوڑ تعلیمی عنصروں کو جوں کا توں لے کر ایک جگہ جمع کر دیا گیا اور ان میں یہ صلاحیت پیدا نہیں کی گئی کہ ایک مرکب علمی قوت بن کر کسی ایک کلچر کی خدمت کر سکیں۔ یکجائی و اجتماع کے باوجود یہ دونوں عنصر نہ صرف ایک دوسرے سے الگ رہتے ہیں، بلکہ ایک دوسرے کی مزاحمت کر کے طلبہ کے ذہن کو دو مخالف سمتوں کی طرف کھینچتے ہیں۔ اسلامی نقطۂ نگاہ سے قطع نظر، خالص تعلیمی نقطۂ نگاہ سے بھی اگر دیکھا جائے تو

یہ کہنا پڑے گا کہ تعلیم میں اس قسم کے متباین اور متزاحم عناصر کی آمیزش اصلاً غلط ہے، اور اس سے کوئی مفید نتیجہ برآمد نہیں ہو سکتا۔

اسلامی نقطہ نظر سے یہ آمیزش اور بھی زیادہ قباحت کا سبب بن گئی ہے، کیونکہ اول تو خود آمیزش ہی درست نہیں، پھر اس پر مزید خرابی یہ ہے کہ یہ آمیزش بھی مساویانہ نہیں ہے۔ اس میں مغربی عنصر بہت طاقتور ہے اور اسلامی عنصر اس کے مقابلہ میں نہایت کمزور ہے۔ مغربی عنصر کو پہلا فائدہ تو یہ حاصل ہے کہ وہ ایک عصری عنصر ہے جس کی پشت پر رفتار زمانہ کی قوت اور ایک عالمگیر حکمران تمدن کی طاقت ہے۔ اس کے بعد وہ ہماری یونیورسٹی کی تعلیم میں ٹھیک اسی شان اور اسی طاقت کے ساتھ شریک کیا گیا ہے جس کے ساتھ وہ ان یونیورسٹیوں میں ہے اور ہونا چاہیے جو مغربی کلچر کی خدمت کے لیے قائم کی گئی ہیں۔ یہاں مغربی علوم و فنون کی تعلیم اس طور پر دی جاتی ہے کہ ان کے تمام اصول اور نظریات مسلمان لڑکوں کی صاف اور سادہ لوحِ دل پر ایمان بن کر ثبت ہو جاتے ہیں، اور ان کی ذہنیت کلیتہً مغربی سانچے میں ڈھل جاتی ہے، حتٰی کہ وہ مغربی نظر سے دیکھنے اور مغربی دماغ سے سوچنے لگتے ہیں، اور یہ اعتقاد ان پر مسلط ہو جاتا ہے کہ دنیا میں اگر کوئی چیز معقول اور باوقعت ہے تو وہی ہے جو مغربی علم و حکمت کے اصول و مبادی سے مطابقت رکھتی ہو۔ پھر ان تاثرات کو مزید تقویت اُس تربیت سے پہنچتی ہے جو ہماری یونیورسٹی میں عملاً دی جا رہی ہے۔ لباس، معاشرت، آداب و اطوار، رفتار و گفتار، کھیل کود، غرض کونسی چیز ہے جس پر مغربی تہذیب و تمدن اور مغربی رجحانات کا غلبہ نہیں ہے۔ یونیورسٹی کا ماحول اگر پورا نہیں تو ۹۵ فی صدی یقیناً مغربی ہے اور ایسے ماحول کے جو اثرات ہو سکتے ہیں اور ہوا کرتے ہیں ان کو ہر صاحب نظر خود سمجھ سکتا ہے۔ اس کے مقابلہ میں اسلامی عنصر نہایت کمزور ہے۔ اول تو وہ اپنی تمدنی و سیاسی طاقت کھو کر ویسے ہی کمزور ہو چکا ہے۔ پھر ہماری یونیورسٹی میں اس کی تعلیم جس نصاب کے ذریعہ

سے دی جاتی ہے وہ زمانے سے صدیوں پیچھے رہ گیا ہے۔ اس کی زبان اور ترتیب و تدوین ایسی نہیں جو عصری دماغوں کو اپیل کر سکے۔ اس میں اسلام کے ابدی اصولوں کو جن حالات اور جن علمی مسائل پر منطبق کیا گیا ہے ان میں سے اکثر اب درپیش نہیں ہیں، اور جو اب درپیش ہیں ان پر ان اصولوں کو منطبق کرنے کی کوئی کوشش نہیں کی گئی ہے۔ مزید براں اس تعلیم کی پشت پر کوئی تربیت کوئی زندہ ماحول، کوئی عملی برتاؤ اور چلن بھی نہیں۔ اس طرح مغربی تعلیم کے ساتھ اسلامی تعلیم کی آمیزش اور بھی زیادہ بے اثر ہو جاتی ہے۔ ایسی نامساوی آمیزش کا طبعی نتیجہ یہ ہے کہ طلبہ کے دل و دماغ پر مغربی عنصر پوری طرح غالب آجائے اور اسلامی عنصر محض ایک سامان مضحکہ بننے کے لیے رہ جائے یا زیادہ سے زیادہ اس لیے کہ زمانۂ ماضی کے آثار باقیہ کی طرح اس کا احترام کیا جائے۔

میں اپنی صاف گوئی پر معافی کا خواستگار ہوں مگر جو کچھ میں دیکھ رہا ہوں اس کو بے کم و کاست بیان کر دینا اپنا فرض سمجھتا ہوں۔ میری نظر میں مسلم یونیورسٹی کی دینی و دنیوی تعلیم بحیثیت مجموعی بالکل ایسی ہے کہ آپ ایک شخص کو از سرتا پا غیر مسلم بناتے ہیں، پھر اس کی بغل میں دینیات کی چند کتابوں کا ایک بستہ دے دیتے ہیں، تاکہ آپ پر اسے غیر مسلم بنانے کا الزام عائد نہ ہو، اور اگر وہ اس بستہ کو اٹھا کر پھینک دے (جس کی وجہ دراصل آپ ہی کی تعلیم ہو گی) تو وہ خود ہی اس فعل کے لیے قابل الزام قرار پائے۔ اس طرز تعلیم سے اگر آپ یہ امید رکھتے ہیں کہ وہ مسلمان پیدا کرے گا تو یوں سمجھنا چاہیے کہ آپ معجزے اور خرق عادت کے متوقع ہیں، کیونکہ آپ نے جو اسباب مہیا کیے ہیں ان سے قانون طبعی کے تحت تو یہ نتیجہ کبھی برآمد نہیں ہو سکتا۔ فی صدی ایک یا دو چار طالب علموں کا مسلمان (کامل اعتقادی و عملی مسلمان) رہ جانا کوئی حجت نہیں ہے۔ یہ آپ کی یونیورسٹی کے فیضان تعلیم و تربیت کا نتیجہ نہیں بلکہ اس امر کا ثبوت ہے کہ جو اس فیضان سے اپنے ایمان و اسلام کو بچا لے گیا وہ دراصل فطرت ابراہیمی پر پیدا ہوا تھا۔ ایسے مستثنیات جس طرح علیگڈھ کے فارغ التحصیل

اصحاب میں پائے جاتے ہیں، اسی طرح ہندوستان کی سرکاری یونیورسٹیوں، بلکہ یورپ کی یونیورسٹیوں کے متخرجین میں بھی مل سکتے ہیں جن کے نصاب میں سرے سے کوئی اسلامی عنصر ہے ہی نہیں۔

اب اگر آپ ان حالات اور اس طرز تعلیم کو بعینہٖ باقی رکھیں اور محض دینیات کے موجودہ نصاب کو بدل کر زیادہ طاقتور نصاب شریک کردیں تو اس کا ماحصل صرف یہ ہوگا کہ فرنگیت اور اسلامیت کی کشمکش زیادہ شدید ہوجائے گی۔ ہر طالب علم کا دماغ ایک رزمگاہ بن جائے گا جس میں یہ دو طاقتیں پوری قوت کے ساتھ جنگ کریں گی، اور بالآخر آپ کے طلبہ تین مختلف گروہوں میں بٹ جائیں گے۔

ایک وہ جن پر فرنگیت غالب رہے گی، عام اس سے کہ وہ انگریزیت کے رنگ میں ہو، یا ہندی وطن پرستی کے رنگ میں یا ملحدانہ اشتراکیت کے رنگ میں۔

دوسرے وہ جن پر اسلامیت غالب رہے گی، خواہ اس کا رنگ گہرا ہو یا فرنگیت کے اثر سے پھیکا پڑجائے۔

تیسرے وہ جو نہ پورے مسلمان ہوں گے نہ پورے فرنگی۔

ظاہر ہے کہ تعلیم کا یہ نتیجہ بھی کوئی خوشگوار نتیجہ نہیں۔ نہ خالص تعلیمی نقطۂ نظر سے اس اجتماع نقیضین کو مفید کہا جاسکتا ہے، اور نہ قومی نقطۂ نظر سے ایسی یونیورسٹی اپنے وجود کو حق بجانب ثابت کرسکتی ہے جس کے نتائج کا ⅔ حصہ قومی مفاد کے خلاف اور قومی تہذیب کے لیے نقصان کامل کا مترادف ہو کم از کم مسلمانوں کی سی غریب قوم کے لیے تو یہ سودا بہت ہی مہنگا ہے کہ وہ لاکھوں روپے کے خرچ سے ایک ایسی ٹکسال جاری رکھے جس میں سے ۳۳ فی صدی سکّے تو مستقل طور پر کھوٹے نکلتے رہیں، اور ۳۳ فی صدی ہمارے خرچ پر تیار ہو کر غیروں کی گود میں ڈال دئے جائیں، بلکہ بالآخر خود ہمارے خلاف استعمال ہوں۔

مذکورۂ بالا بیان سے دو باتیں اچھی طرح واضح ہو جاتی ہیں:-

اولاً، تعلیم میں متضاد عناصر کی آمیزش اصولی حیثیت سے غلط ہے۔

ثانیاً، اسلامی مفاد کے لیے بھی ایسی آمیزش کسی طرح مفید نہیں، خواہ وہ اُسی قسم کی غیر مساوی آمیزش ہو جیسی اب تک رہی ہے، یا مساوی کر دی جائے، جیسا کہ اب کرنے کا خیال کیا جا رہا ہے۔

ان امور کی توضیح کے بعد میں یہ بتانا چاہتا ہوں کہ میری رائے میں یونیورسٹی کی تعلیمی پالیسی اب کیا ہونی چاہیے۔

یہ ظاہر ہے کہ ہر یونیورسٹی کسی نہ کسی کلچر کی خادم ہوتی ہے۔ ایسی مجرد تعلیم جو ہر رنگ اور ہر صورت سے خالی ہو، نہ آج تک دنیا کی کسی درسگاہ میں دی گئی ہے، نہ آج دی جا رہی ہے۔ ہر درسگاہ کی تعلیم ایک خاص رنگ اور خاص صورت میں ہوتی ہے، اور اس رنگ و صورت کا انتخاب پورے غور و فکر کے بعد اُس مخصوص کلچر کی مناسبت سے کیا جاتا ہے جس کی خدمت وہ کرنا چاہتی ہے اب سوال یہ ہے کہ آپ کی یونیورسٹی کس کلچر کی خدمت کے لیے قائم کی گئی ہے؟ اگر وہ مغربی کلچر ہے، تو اس کو مسلم یونیورسٹی نہ کہیے، نہ اس میں دینیات کا ایک نصاب رکھ کر خوامخواہ طالب علموں کو ذہنی کشمکش میں مبتلا کیجیے۔ اور اگر وہ اسلامی کلچر ہے تو آپ کو اپنی یونیورسٹی کی پوری ساخت بدلنی پڑے گی اور اس کی ہیئت ترکیبی کو ایسے طرز پر ڈھالنا ہوگا کہ وہ بحیثیت مجموعی اس کلچر کے مزاج اور اس کی اسپرٹ کے مناسب ہو، اور نہ صرف اس کا تحفظ کرے، بلکہ اس کو آگے بڑھانے کے لیے ایک اچھی طاقت بن جائے۔

جیسا کہ میں اوپر ثابت کر چکا ہوں کہ موجودہ حالت میں تو آپ کی یونیورسٹی اسلامی کلچر کی نہیں بلکہ مغربی کلچر کی خادم بنی ہوئی ہے۔ اس حالت میں اگر صرف اتنا تغیر کیا جائے کہ دینیات کے

موجودہ نصاب کو بدل کر زیادہ طاقتور کر دیا جائے اور تعلیم و تربیت کے باقی تمام شعبوں میں پوری مغربیت برقرار رہے تو اس سے بھی یہ درسگاہ اسلامی کلچر کی خادم نہیں بن سکتی۔ اسلام کی حقیقت پر غور کرنے سے یہ بات خود بخود آپ پر منکشف ہو جائیگی کہ دنیوی تعلیم و تربیت اور دینی تعلیم کو الگ کرنا اور ایک دوسرے سے مختلف کرکے ان دونوں کو یکجا جمع کر دینا بالکل لاحاصل ہے۔ اسلام، مسیحیت کی طرح کوئی ایسا مذہب نہیں ہے جس کا دین دنیا سے الگ کوئی چیز ہو۔ وہ دنیا کو دنیا والوں کے لئے چھوڑ کر صرف اعتقادیات اور اخلاقیات کی حد تک اپنے دائرے کو محدود نہیں رکھتا اس لئے مسیحی دینیات کی طرح اسلام کے دینیات کو دنیویات سے الگ نہیں کیا جا سکتا۔ اسلام کا اصل مقصد انسان کو دنیا میں رہنے اور دنیا کے معاملات انجام دینے کے لئے ایک ایسے طریقہ پر تیار کرنا ہے جو اس زندگی سے لیکر آخرت کی زندگی تک سلامتی عزت اور برتری کا طریقہ ہے اس غرض کے لئے وہ اس کی نظر و فکر کو درست کرتا ہے اس کے اخلاق کو سنوارتا ہے اس کی سیرت کو ایک خاص سانچے میں ڈھالتا ہے، اس کے لیے حقوق و فرائض معین کرتا ہے۔ اور اس کو اجتماعی زندگی کا ایک خاص نظام وضع کر کے دیتا ہے۔ افراد کی ذہنی و عملی تربیت، سوسائٹی کی تشکیل و تنظیم اور زندگی کے تمام شعبوں کی ترتیب و تعدیل کے باب میں اس کے اصول و ضوابط سب سے الگ ہیں، انہی کی بدولت اسلامی تہذیب ایک جداگانہ تہذیب کی شکل اختیار کرتی ہے، اور مسلمان قوم کا بحیثیت ایک قوم کے زندہ رہنا انہی کی پابندی پر منحصر ہے پس جب حال یہ ہے تو "اسلامی دینیات" کی اصطلاح بے معنی ہو جاتی ہے اگر زندگی اور اس کے معاملات سے اس کا ربط باقی نہ رہے اسلامی کلچر کے لیے وہ عالم دین بیکار ہے جو اسلام کے عقائد اور اصول سے تو واقف ہے مگر ان کو لے کر علم و عمل کے میدان میں بڑھنا اور زندگی کے دائم التغیر احوال و مسائل میں ان کو برتنا نہیں جانتا۔ اسی طرح اس کلچر کے لیے وہ عالم دنیا بھی بیکار ہے جو دل میں تو اسلام کی صداقت پر ایمان رکھتا ہے مگر دماغ سے غیر اسلامی طریق پر سوچتا ہے معاملات کو غیر اسلامی نظر سے دیکھتا ہے اور زندگی کو غیر اسلامی اصولوں پر مرتب کرتا ہے اسلامی تہذیب

کے زوال اور اسلامی نظام تمدن کی ابتری کا اصل سبب یہی ہے کہ ایک مدت سے ہماری قوم میں صرف انہی دو قسموں کے عالم پیدا ہو رہے ہیں، اور دنیوی علم و عمل سے علم دین کا رابطہ ٹوٹ گیا ہے۔ اب اگر آپ چاہتے ہیں کہ اسلامی کلچر پھر سے جوان ہو جائے اور زمانہ کے پیچھے چلنے کے بجائے آگے چلنے لگے، تو اس ٹوٹے ہوئے ربط کو پھر قائم کیجیے۔ مگر اس کو قائم کرنے کی صورت یہ نہیں ہے، کہ دینیات کے نصاب کو جسم تعلیمی کی گردن کا قلادہ یا کمر کا پشتارہ بنا دیا جائے۔ نہیں۔ اس کو پورے نظام تعلیم و تربیت میں اس طرح اتار دیجیے کہ وہ اس کا دوران خون، اس کی روح رواں اس کی بینائی و سماعت، اس کا احساس و ادراک، اس کا تشعور و فکر بن جائے، اور مغربی علوم و فنون کے تمام صالح اجزا کو اپنے اندر جذب کر کے اپنی تہذیب کا جز بناتا چلا جائے۔ اس طرح آپ مسلمان فلسفی، مسلمان سائنس دان، مسلمان ماہرین معاشیات، مسلمان مقنن، مسلمان مدبرین، غرض تمام علوم و فنون کے مسلمان ماہر پیدا کر سکیں گے، جو زندگی کے مسائل کو اسلامی نقطۂ نظر سے حل کریں گے، تہذیب حاضر کے ترقی یافتہ اسباب و وسائل سے تہذیب اسلامی کی خدمت لیں گے اور اسلام کے افکار و نظریات اور قوانین حیات کو روح عصری کے لحاظ سے از سر نو مرتب کرینگے یہاں تک کہ اسلام از سر نو علم و عمل کے ہر میدان میں اسی امامت و رہنمائی کے مقام پر آ جائیگا جس کے لیے وہ درحقیقت دنیا میں بھیجا گیا ہے۔

یہ ہے وہ تخیل جو مسلمانوں کی جدید تعلیمی پالیسی کا اساسی تخیل ہونا چاہیے۔ زمانہ اس مقام سے بہت آگے نکل چکا ہے جس پر سرسید ہم کو چھوڑ گئے تھے۔ اگر اب زیادہ عرصہ تک ہم اس پر قائم رہے تو بحیثیت ایک مسلم قوم کے ہمارا ترقی کرنا تو درکنار، زندہ رہنا بھی مشکل ہے۔

(۲)

اب میں یہ بتانا چاہتا ہوں کہ اوپر جس تعلیمی پالیسی کا ہیولی میں نے پیش کیا ہے اس کو

صورت کا لباس کس طرح پہنایا جا سکتا ہے۔

(۱) مسلم یونیورسٹی کے حدود میں "فرنگیت" کا کلی استیصال کر دینا نہایت ضروری ہے۔ اگر ہم اپنی قومی تہذیب کو اپنے ہاتھوں قتل کرنا نہیں چاہتے، تو ہمارا فرض ہے کہ اپنی نئی نسلوں میں "فرنگیت" کے ان روز افزوں رجحانات کا سدباب کریں۔ یہ رجحانات دراصل غلامانہ ذہنیت اور باطنی احساس ونائت ( Inferiority Complex ) کی پیداوار ہیں پھر جب ان کا عملی ظہور لباس، معاشرت، آداب و اطوار اور بحیثیت مجموعی پورے اجتماعی ماحول میں ہوتا ہے تو یہ ظاہر اور باطن دونوں طرف سے نفس کا احاطہ کر لیتے ہیں، اور اس میں شرف قومی کا رمق برابر احساس بھی نہیں چھوڑتے۔ ایسے حالات میں اسلامی تہذیب کا زندہ رہنا قطعی ناممکن ہے۔ کوئی تہذیب محض اپنے اصولوں اور اپنے اساسی تصورات کے مجرّد ذہنی وجود سے پیدا نہیں ہوتی بلکہ عملی برتاؤ سے پیدا ہوتی ہے اور اسی سے نشوونما پاتی ہے۔ اگر عملی برتاؤ مفقود ہو جائے تو تہذیب اپنی طبعی موت مر جائے گی، اور اس کا ذہنی وجود بھی برقرار نہ رہ سکے گا پس سب سے مقدم اصلاح یہ ہے کہ یونیورسٹی میں ایک زندہ اسلامی ماحول پیدا کیا جائے۔ آپ کی تربیت ایسی ہونی چاہیے جو مسلمانوں کی نئی نسلوں کو اپنی قومی تہذیب پر فخر کرنا سکھائے۔ ان میں اپنی قومی خصوصیات کا احترام بلکہ عشق پیدا کرے، ان میں اسلامی اخلاق اور اسلامی سیرت کی روح پھونک دے، اور ان کو اس قابل بنائے کہ وہ اپنے علم اور اپنی تربیت یافتہ ذہنی صلاحیتوں سے اپنے قومی تمدن کو شائستگی کے بلند مدارج کی طرف لے چلیں۔

(۲) اسلامی اسپرٹ پیدا کرنے کا انحصار بڑی حد تک معلمین کے علم و عمل پر ہے۔ جو معلم خود اس روح سے خالی ہیں، بلکہ خیال اور عمل دونوں میں اس کے مخالف ہیں ان کے زیر اثر رہ کر متعلمین کس اسلامی اسپرٹ کیسے پیدا ہو سکتی ہے۔ آپ محض عمارت کا نقشہ بنا سکتے ہیں، مگر اصلی معمار آپ نہیں

آپ کے تعلیمی اسٹاف کے ارکان ہیں۔ "فرنگی معماروں" سے یہ امید رکھنا کہ وہ اسلامی طرز تعمیر پر عمارت بنائیں گے، کریلے کی بیل سے خوشۂ انگور کی امید رکھنا ہے محض دینیات کے لیے چند "مولوی" رکھ لینا ایسی صورت میں بالکل فضول ہوگا جبکہ دوسرے تمام یا اکثر علوم کے پڑھانے والے غیر مسلم یا ایسے مسلمان ہوں جن کے خیالات غیر اسلامی ہوں، کیونکہ وہ زندگی اور اس کے مسائل اور معاملات کے متعلق طلبہ کے نظریات اور تصورات کو اسلام کے مرکز سے پھیر دیں گے، اور اس زہر کا تریاق محض دینیات کے کورس سے فراہم نہ ہوسکے گا۔ لہٰذا خواہ کوئی فن ہو، فلسفہ ہو یا سائنس، یا معاشیات یا قانون، یا کوئی اور، مسلم یونیورسٹی میں اس کی پروفیسری کے لیے کسی شخص کا محض ماہر فن ہونا کافی نہیں ہے، بلکہ یہ بھی ضروری ہے کہ وہ پورا اور پکا مسلمان ہو۔ اگر مخصوص حالات میں کسی غیر مسلم ماہر فن کی خدمات حاصل کرنی پڑیں تو کوئی مضائقہ نہیں لیکن عام قاعدہ یہی ہونا چاہیے کہ ہماری یونیورسٹی کے پروفیسر وہ لوگ ہوں جو اپنے فن میں ماہر ہونے کے علاوہ یونیورسٹی کے اساسی مقصد یعنی اسلامی کلچر کے لیے خیالات اور اعمال دونوں کے لحاظ سے مفید ہوں۔

(۳) یونیورسٹی کی تعلیم میں عربی زبان کو بطور ایک لازمی زبان کے شریک کیا جائے۔ یہ ہماری کلچر کی زبان ہے اسلام کے مآخذ اصلیہ تک پہنچنے کا واحد ذریعہ ہے جب تک مسلمانوں کا تعلیم یافتہ طبقہ قرآن اور سنت تک بلا واسطہ دسترس حاصل نہ کریگا اسلام کی روح کو نہ پاسکے گا نہ اسلام میں بصیرت حاصل کرسکے گا۔ وہ ہمیشہ مترجموں اور شارحوں کا محتاج رہے گا، اور اس طرح آفتاب کی روشنی اس کو براہ راست آفتاب سے کبھی نہ مل سکے گی، بلکہ مختلف قسم کے رنگین آئینوں کے واسطے ہی سے ملتی رہیگی۔ آج ہمارے جدید تعلیمیافتہ حضرات اسلامی مسائل میں ایسی ایسی غلطیاں کر رہے ہیں جن سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ اسلام کی ابجد تک سے ناواقف ہیں۔ اس کی وجہ یہی ہے کہ وہ قرآن اور سنت سے استفادہ کا کوئی ذریعہ نہیں رکھتے۔ آگے چل کر پراونشل آٹانومی کے دور میں جب

ہندوستان کی مجالس مقننہ کو قانون سازی کے زیادہ وسیع اختیارات حاصل ہوں گے اور سوشل ریفارم کے لیے نئے نئے قوانین بنائے جانے لگیں گے اس وقت اگر مسلمانوں کی نمائندگی ایسے لوگ کرتے رہے جو اسلام سے ناواقف ہوں اور اخلاق و معاشرت اور قانون کے مغربی تصورات پر اعتقاد رکھتے ہوں، تو جدید قانون سازی سے مسلمانوں میں سوشل ریفارم ہونے کے بجائے الٹی سوشل ڈیفارم ہوگی اور مسلمانوں کا اجتماعی نظام اپنے اصولوں سے اور زیادہ دور ہوتا چلا جائیگا پس عربی زبان کے مسئلہ کو محض ایک زبان کا مسئلہ نہ سمجھیے، بلکہ یوں سمجھیے کہ یہ آپ کی یونیورسٹی کے اساسی مقصد سے تعلق رکھتا ہے اور جو چیز اساسیات سے تعلق رکھتی ہو اس کے لیے سہولت کا لحاظ نہیں کیا جاتا، بلکہ ہر حال میں اس کی جگہ نکالنی پڑتی ہے۔

(۴) ہائی اسکول کی تعلیم میں طلبا کو حسب ذیل مضامین کی ابتدائی معلومات حاصل ہونی چاہئیں

الف ۔ عقائد ۔ اس مضمون میں عقائد کی خشک کلامی تفصیلات نہ ہونی چاہئیں ۔ بلکہ ایمانیات کو ذہن نشین کرنے کے لیے نہایت لطیف انداز بیان اختیار کرنا چاہیے جو فطری وجدان اور عقل سلیم کو اپیل کرنے والا ہو۔

طلبہ کو یہ معلوم ہونا چاہیے کہ اسلام کے ایمانیات دراصل کائنات کی بنیادی صداقتیں ہیں اور یہ صداقتیں ہماری زندگی سے ایک گہرا ربط رکھتی ہیں۔

ب ۔ اسلامی اخلاق ۔ اس مضمون میں مجرد اخلاقی تصورات نہ پیش کیے جائیں ۔ بلکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابۂ کرام اور انبیاء علیہم السلام کی سیرتوں سے ایسے واقعات لیکر جمع کیے جائیں جن سے طلبہ کو معلوم ہو کہ ایک مسلمان کے کیرکٹر کی خصوصیات کیا ہیں، اور مسلمان کی زندگی کیسی ہوتی ہے۔

ج ۔ احکام فقہ ۔۔ اس مضمون میں حقوق اللہ اور حقوق العباد اور شخصی کردار کے متعلق اسلامی

قانون کے ابتدائی اور ضروری احکام بیان کیے جائیں جن سے واقف ہونا ہر مسلمان کے لیے ناگزیر ہے۔ مگر اس قسم کے جزئیات اس میں نہ ہونے چاہئیں جیسے ہماری فقہ کی پرانی کتابوں میں آتے ہیں کہ مثلاً کوئیں میں چوہا گر جائے تو کتنے ڈول نکالے جائیں۔

د۔ اسلامی تاریخ یہ مضمون صرف سیرت رسول اور دورِ صحابہ تک محدود رہے۔ اس کے پڑھانے کی غرض یہ ہونی چاہیے کہ طلبہ اپنے مذہب اور اپنی قومیت کی اصل سے واقف ہوجائیں اور ان کے دلوں میں قومی افتخار کا جذبہ پیدا ہو۔

ہ۔ عربیت عربی زبان کا محض ابتدائی علم جو ادب سے ایک حد تک مناسبت پیدا کردے۔

س۔ قرآن صرف اتنی استعداد کہ لڑکے کتاب اللہ کو روانی کے ساتھ پڑھ سکیں۔ سادہ آیتوں کو کسی حد تک سمجھ سکیں، اور چند صورتیں بھی ان کو یاد ہوں۔

(۵) کالج کی تعلیم میں ایک نصاب عام ہونا چاہیے جو تمام طلبا کو پڑھایا جائے۔ اس نصاب میں حسب ذیل مضامین ہونے چاہئیں۔

الف عربیت انٹرمیڈیٹ میں عربی ادب کی متوسط تعلیم ہو۔ بی اے میں پہنچ کر اس مضمون کو تعلیم قرآن کے ساتھ ضم کر دیا جائے۔

ب قرآن۔ انٹرمیڈیٹ میں طلبہ کو فہم قرآن کے لیے مستعد کیا جائے۔ اس مرحلہ میں صرف چند مقدمات ذہن نشین کرا دینے چاہئیں۔ قرآن کا محفوظ اور تاریخی حیثیت سے معتبر ترین کتاب ہونا۔ اس کا وحی الٰہی ہونا۔ تمام مذاہب کی اساسی کتابوں کے مقابلہ میں اس کی فضیلت۔ اس کی بے نظیر انقلاب انگیز تعلیم۔ اس کے اثرات نہ صرف عرب پر بلکہ تمام دنیا کے افکار اور قوانین حیات پر۔ اس کا اندازِ بیان

اور طرز استدلال۔

بی اے میں اصل قرآن کی تعلیم دی جائے۔ یہاں طرز تعلیم یہ ہونا چاہیے کہ طلبہ خود قرآن کو پڑھ کر سمجھنے کی کوشش کریں اور استاد ان کی مشکلات کو حل اور ان کے شبہات کو رفع کرتا جائے۔ اگر مفصل تفسیر اور جزئی بحثوں سے اجتناب ہو، اور صرف مطالب کی توضیح پر اکتفا کیا جائے تو دو سال میں بآسانی پورا قرآن پڑھایا جا سکتا ہے۔

ج۔ تعلیمات اسلامی اس مضمون میں طلبا کو پورے نظام اسلامی سے روشناس کرا دیا جائے۔ اسلام کی بنیاد کن اساسی تصورات پر قائم ہے۔ ان تصورات کی بنا پر وہ اخلاق اور سیرت کی تشکیل کس طرح کرتا ہے۔ پھر انہی کی بنا پر وہ کس طرح ایک سوسائٹی کا نظام مرتب کرتا ہے۔ پھر اس سوسائٹی کی زندگی کو وہ معاشرت، معیشت، سیاست اور بین الاقوامی تعلقات میں کن اصولوں پر منظم کرتا ہے۔ اس کے اجتماعی نظام میں فرد اور جماعت کے درمیان حقوق و فرائض کی تقسیم کس ڈھنگ پر کی گئی ہے۔ حدود اللہ کیا ہیں؟ ان حدود کے اندر مسلمان کو کس حد تک فکر و عمل کی آزادی حاصل ہے اور ان حدود کے باہر قدم نکالنے سے نظام اسلامی پر کیا اثرات مترتب ہوتے ہیں۔ یہ تمام امور جامعیت کے ساتھ ایک نصاب میں لائے جائیں اور اس کو چار سال کے مدارج تعلیمی پر ایک مناسبت کے ساتھ تقسیم کر دیا جائے۔

(۶) نصاب عام کے بعد علوم اسلامیہ کو تقسیم کر کے مختلف علوم و فنون کی اختصاصی تعلیم میں پھیلا دیجیے اور ہر فن میں اسی فن کی مناسبت سے اسلام کی تعلیمات کو پیوست کیجیے۔ مغربی علوم و فنون بجائے خود سب کے سب مفید ہیں، اور اسلام کو ان میں سے کسی کے ساتھ بھی دشمنی نہیں، بلکہ ایجاباً میں یہ کہوں گا

کہ جہاں تک حقائق علمیہ کا تعلق ہے، اسلام ان کا دوست ہے اور وہ اسلام کے دوست ہیں۔ دشمنی
دراصل علم اور اسلام میں نہیں بلکہ "مغربیت" اور اسلام میں ہے۔ اکثر علوم میں اہل مغرب اپنے
چند مخصوص اساسی تصورات، بنیادی مفروضات (Hypotheses) نقطہائے آغاز (
Starting points) اور زوایائے نظر رکھتے ہیں جو بجائے خود ثابت شدہ حقائق نہیں
ہیں بلکہ محض ان کے اپنے وجدانیات ہیں وہ حقائق کو لے کر اپنے ان وجدانیات کے سانچے میں
ڈھالتے ہیں، اور اس سانچے کی مناسبت سے ان کو مرتب کرکے ایک مخصوص نظام بنا لیتے ہیں
اسلام کی دشمنی دراصل انہی وجدانیات سے ہے۔ وہ حقائق کا دشمن نہیں بلکہ اس وجدانی سانچے کا
دشمن ہے جس میں ان حقائق کو ڈھالا اور مرتب کیا جاتا ہے۔ وہ خود اپنا ایک مرکزی تصور،
ایک زاویہ نظر، ایک نقطۂ آغازِ فکر، ایک وجدانی سانچہ رکھتا ہے جو اپنی اصل اور فطرت کے
اعتبار سے مغربی سانچے کی عین ضد واقع ہوا ہے۔ اب یہ سمجھ لیجیے کہ اسلامی نقطۂ نظر سے ضلالت
کی اصل وجہ یہ نہیں ہے کہ آپ مغربی علوم وفنون سے حقائق لیتے ہیں، بلکہ یہ ہے کہ آپ مغرب
ہی سے اس کا وجدانی سانچہ بھی لے لیتے ہیں۔ فلسفہ، سائنس، تاریخ، قانون، سیاسیات، معاشیات
اور دوسرے علمی شعبوں میں آپ خود ہی اپنے نوجوان اور خالی الذہن طلبہ کے دماغوں میں مغرب
کے اساسی تصورات بٹھاتے ہیں ان کی نظر کو مغربی زاویہ نظر کے مطابق نصب کرتے ہیں،
مغربی مفروضات کو مسلمات بناتے ہیں، استدلال واستنباط اور تحقیق وتفحص کے لیے صرف وہی
ایک نقطۂ آغاز ان کو دیتے ہیں جو اہل مغرب کا نقطۂ آغاز ہے اور تمام علمی حقائق اور مسائل کو
اُسی طرز پر مرتب کرکے ان کے ذہن میں اتار دیتے ہیں جس طرز پر اہل مغرب نے ان کو مرتب کیا
ہے۔ اس کے بعد صرف ایک دینیات کا شعبہ کیا کر سکتا ہے جس میں مجرد تصورات ہیں مگر حقائق
علمیہ اور مسائل حیات پر ان تصورات کا انطباق نہیں بلکہ طلبہ کے ذہن میں جملہ معلومات کی ترتیب

ان تصورات کے بالکل برعکس ہے۔ یہی گمراہی کا سرچشمہ ہے۔ اگر آپ گمراہی کا سدباب کرنا چاہتے ہیں تو اس سرچشمہ کے مصدر پر پہنچ کر اس کا رخ پھیر دیجیے، اور تمام علمی شعبوں کو وہ نقطۂ آغاز، وہ زاویۂ نظر، وہ اساسی اصول دیجیے جو قرآن نے آپ کو دیے ہیں۔ جب اس وجدانی سانچہ میں معلومات مرتب ہوں گی اور اس نظریے کائنات اور زندگی کے مسائل کو حل کیا جائے گا تب آپ کے طلبہ مسلم طلبہ بنیں گے اور آپ یہ کہہ سکیں گے کہ ہم نے ان میں "اسلامی اسپرٹ" پیدا کی ورنہ ایک شعبہ میں اسلام اور باقی تمام شعبوں میں غیر اسلام رکھ دینے کا نتیجہ اس کے سوا کچھ نہ ہوگا کہ آپ کے فارغ التحصیل طلبہ فلسفہ میں غیر مسلم، سائنس میں غیر مسلم، قانون میں غیر مسلم، سیاسیات میں غیر مسلم، فلسفہ تاریخ میں غیر مسلم، عمرانیات میں غیر مسلم ہوں گے اور ان کا اسلام محض چند اعتقادات اور چند مذہبی مراسم کی حد تک رہ جائے گا۔

(۷) بی ٹی ایچ اور ایم ٹی ایچ کے امتحانات کو بند کر دیجیے۔ نہ ان کی کوئی ضرورت نہ کوئی فائدہ۔ جہاں تک علوم اسلامیہ کے مخصوص شعبوں کا تعلق ہے ان میں سے ہر ایک شعبے کو اسی کے مماثل علم کے مغربی شعبہ کے انتہائی کورس میں داخل کر دیجیے۔ مثلاً فلسفہ میں حکمت اسلامیہ اور اسلامی فلسفہ کی تاریخ اور فلسفیانہ افکار کے ارتقا میں مسلمانوں کا حصہ۔ تاریخ میں تاریخ اسلام اور اسلامی فلسفہ تاریخ۔ قانون میں اسلامی قانون کے اصول اور فقہ کے وہ ابواب جو معاملات سے متعلق ہیں۔ معاشیات میں اسلامی معاشیات کے اصول اور فقہ کے وہ حصے جو معاشی مسائل سے متعلق ہیں۔ سیاسیات میں اسلام کے نظریات سیاسی اور اسلامی سیاسیات کے نشو و ارتقا کی تاریخ اور دنیا کے سیاسی افکار کی ترقی میں اسلام کا حصہ۔

(۸) اس کورس کے بعد علوم اسلامیہ میں ریسرچ کے لیے ایک مستقل شعبہ ہونا چاہیے جو مغربی یونیورسٹیوں کی طرح اعلیٰ درجہ کی علمی تحقیق پر سند فضیلت ( Doclorate ) دیا کرے۔ اس شعبہ میں ایسے لوگ تیار کیے جائیں جو مجتہدانہ طرز تحقیق کی تربیت پا کر نہ صرف مسلمانوں

بلکہ اسلامی نقطۂ نظر سے دنیا کی نظری و فکری رہنمائی کے لیے مستعد ہوں۔

(۳)

حصۂ دوم میں جس طرزِ تعلیم کا خاکہ میں نے پیش کیا ہے وہ بظاہر نا قابل عمل معلوم ہوتا ہے لیکن میں کافی غور و خوض کے بعد اس نتیجہ پر پہنچا ہوں کہ توجہ اور محنت اور صرفِ مال سے اس کو بتدریج عمل میں لایا جاسکتا ہے۔

یہ حقیقت پیش نظر رہنی چاہیے کہ آپ کسی راہ میں پہلا قدم اٹھاتے ہی منزل کے آخری نشان پر نہیں پہنچ سکتے۔ کام کی ابتدا کرنے کے لیے یہ ضروری نہیں ہے کہ اسکی تکمیل کا پورا سامان پہلے سے آپ کے پاس موجود ہو۔ ابھی تو آپ کو صرف عمارت کی بنیاد رکھنی ہے، اور اُس کا سامان اس وقت فراہم ہوسکتا ہے۔ موجودہ نسل میں ایسے لوگ موجود ہیں جو اس طرز تعمیر پر بنیادیں اُٹھا سکتے ہیں۔ ان کی تعلیم و تربیت سے جو نسل اٹھے گی وہ دیواریں اٹھانے کے قابل ہوگی، اور پھر تیسری نسل ایسی نکلیگی جس کے ہاتھوں یہ کام انشاء اللہ پایۂ تکمیل کو پہنچے گا۔ جو درجہ کمال کم از کم تین نسلوں کی مسلسل محنت کے بعد حاصل ہوسکتا ہے، اس کو آج ہی حاصل کر لینا ممکن نہیں، اور اگر اس کے حصول کو غیر ممکن دیکھ کر آپ اس کی ابتدا ہی نہ کریں، حالانکہ ابتدا کرنے کے اسباب آپ کے پاس موجود ہیں تو یہ سراسر نادانی ہوگی۔

چونکہ میں اس اصلاحی اقدام کا مشورہ دے رہا ہوں اس لیے یہ بھی میرا ہی فرض ہے کہ اس کو عمل میں لانے کی تدابیر بھی پیش کروں۔ اپنے بیان کے اس حصہ میں، میں یہ بتانا چاہتا ہوں کہ اس طرز تعلیم کی ابتدا کس طرح کی جاسکتی ہے اور اس کے لیے قابل عمل تدبیریں کیا ہیں۔

(۱) ہائی اسکول کی تعلیم کے لیے عقائد، اسلامی اخلاق اور احکام شریعت کا ایک جامع کورس حال ہی میں سرکار نظام کے محکمۂ تعلیمات نے تیار کرایا ہے۔ اس کو تھوڑی سی ترمیم کے ساتھ بہت

کارآمد بنایا جاسکتا ہے۔

عربی زبان کی تعلیم قدیم طرز کی وجہ سے جس قدر ہولناک ہوگئی تھی، الحمدللہ کہ اب وہ کیفیت باقی نہیں رہی۔ اس کے لیے جدید طریقے مصروشام اور خود ہندوستان میں ایسے نکل آئے ہیں جن سے بآسانی یہ زبان سکھائی جاسکتی ہے۔ ایک خاص کمیٹی ان لوگوں کی مقرر کی جائے جو عربی تعلیم کے جدید طریقوں میں علمی وعملی مہارت رکھتے ہیں اور ان کے مشورہ سے ایک ایسا کورس تجویز کیا جائے جس میں زیادہ تر قرآن ہی کو عربی کی تعلیم کا ذریعہ بنایا گیا ہو۔ اس طرح تعلیم قرآن کے لیے الگ وقت نکالنے کی بھی ضرورت نہ رہے گی اور ابتداہی سے طلبہ کو قرآن کے ساتھ مناسبت پیدا ہو جائے گی۔

اسلامی تاریخ کے بکثرت رسالے اردو زبان میں لکھے جاچکے ہیں۔ ان کو جمع کرکے بنظر غور دیکھا جائے اور جو رسائل مفید پائے جائیں ان کو ابتدائی جماعتوں کے کورس میں داخل کرلیا جائے۔

مقدم الذکر دونوں مضامین کے لیے روزانہ صرف ایک گھنٹہ کافی ہوگا۔ اسلامی تاریخ کا مضمون کوئی الگ وقت نہیں چاہتا۔ تاریخ کے عمومی نصاب میں اس کو ضم کیا جاسکتا ہے۔ اس طرح میں سمجھتا ہوں کہ ہائی اسکول کی تعلیم کے موجودہ نظم میں کوئی زیادہ تغیر کرنے کی ضرورت پیش نہ آئے گی۔ تغیر کی ضرورت جو کچھ بھی ہے نصاب تعلیم، طرز تعلیم اور تعلیمی اسٹاف میں ہے۔ دینیات کی تدریس اور اس کے مدرس کا جو تصور آپ کے ذہن میں اب تک رہا ہے اس کو نکال دیجیے۔ ۱۹۳۶ء کے لڑکے کی ذہنیت اور اس کے نفسیات کو سمجھنے والے مدرس رکھیے، ان کو ایک ترقی یافتہ نصاب تعلیم دیجیے، اور اس کے ساتھ ایسا ماحول پیدا کیجیے جس میں "اسلامیت" کے بیج کو بالیدگی نصیب ہوسکے۔

(۲) کالج کے لیے نصاب عام کی جو تجویز میں نے پیش کی ہے اس کے تین اجزا ہیں:-

(الف) عربیت۔ (ب) قرآن۔ (ج) تعلیمات اسلامی۔

ان میں سے عربیت کو آپ ثانوی لازمی زبان کی حیثیت دیجیے۔ دوسری زبانوں میں سے کسی کی تعلیم اگر طلبہ حاصل کرنا چاہیں تو ٹیوٹرس کے ذریعہ سے حاصل کر سکتے ہیں۔ مگر کالج میں انگریزی زبان (یعنی ذریعۂ تعلیم کے بعد جو دوسری زبانیں بطور ثانوی زبان کے پڑھائی جاتی ہیں ان کو موقوف کر کے صرف عربی کی تعلیم دیجیے۔ اگر نصاب اچھا ہو اور پڑھانے والے آزمودہ کار ہوں تو انٹرمیڈیٹ کے دو سالوں میں طلبہ کے اندر اتنی استعداد پیدا کی جاسکتی ہے کہ وہ بی اے میں پہنچ کر قرآن کی تعلیم خود قرآن کی زبان میں حاصل کر سکیں۔

قرآن کے لیے کسی تفسیر کی حاجت نہیں۔ ایک اعلیٰ درجہ کا پروفیسر کافی ہے جس نے قرآن کا بنظر غائر مطالعہ کیا ہو، اور جو طرز جدید پر قرآن پڑھانے اور سمجھانے کی اہلیت رکھتا ہو وہ اپنے لکچروں سے انٹرمیڈیٹ میں طلبہ کے اندر قرآن فہمی کی ضروری استعداد پیدا کرے گا پھر بی۔ اے میں ان کو پورا قرآن اس طرح پڑھا دے گا کہ وہ عربیت میں بھی کافی ترقی کر جائیں گے اور اسلام کی روح سے بھی بخوبی واقف ہو جائیں گے۔

تعلیمات اسلامی کے لیے ایک جدید کتاب لکھوانے کی ضرورت ہے جو ان مقاصد پر حاوی ہو جن کی طرف میں نے حصۂ دوم کے نمبر ۵، ضمن (ج) میں اشارہ کیا ہے کچھ عرصہ ہوا کہ میں نے خود ان مقاصد کو پیش نظر رکھ کر ایک کتاب اسلامی تہذیب اور اس کے اصول و مبادی کے عنوان سے لکھنی شروع کی تھی جس کے ابتدائی تین باب "ترجمان القرآن" میں محرم ۵۲ھ سے شعبان ۵۳ھ تک کے پرچوں میں شائع ہوئے ہیں۔ اگر اس کو مفید سمجھا جائے تو میں اس کی تکمیل کر کے یونیورسٹی کے نذر کر دوں گا۔

ان مضامین کے لیے کالج کی تعلیم کے موجودہ نظم میں کسی تغیر کی ضرورت پیش نہ آئے گی عربیت کے لیے وہی وقت کافی ہے جو آپ کے ہاں ثانوی زبان کے لیے ہے۔ قرآن اور تعلیمات اسلامیہ دونوں کے لیے باری باری سے وہی وقت کافی ہوسکتا ہے جو آپ کے ہاں دینیات کے لیے مقرر ہے۔

(۳) زیادہ تر مشکل اس تجویز کو عملی جامہ پہنانے میں پیش آئے گی جسے میں نے حصہ دوم کے نمبر ۲ میں پیش کیا ہے۔ اس کے حل کی تین صورتیں ہیں جن کو بتدریج اختیار کیا جاسکتا ہے۔

**الف** ایسے پروفیسر تلاش کیے جائیں (اور وہ ناپید نہیں ہیں) جو علوم جدیدہ کے ماہر ہونے کے ساتھ قرآن اور سنت میں بھی بصیرت رکھتے ہوں جن میں اتنی اہلیت ہو کہ مغربی علوم کے حقائق کو ان کے نظریات اور ان کی وجدانی اساس سے الگ کرکے اسلامی اصول و نظریات کے مطابق مرتب کرسکیں۔

(ب) اسلامی فلسفہ، قانون، اصول قانون و فلسفہ تشریع، سیاسیات، عمرانیات، معاشیات، تاریخ و فلسفہ تاریخ وغیرہ کے متعلق عربی، اردو، انگریزی، جرمن اور فرنچ زبانوں میں جس قدر لٹریچر موجود ہے اس کی چھان بین کی جائے۔ جو کتابیں بعینہٖ لینے کے قابل ہوں ان کا انتخاب کرلیا جائے۔ اور جن کو اقتباس یا حذف و ترمیم کے ساتھ کارآمد بنایا جاسکتا ہو ان کو اسی طریق پر کام میں لایا جائے۔ اس غرض کے لیے اہل علم کی ایک خاص جمعیت مقرر کرنی ہوگی۔

(ج) چند ایسے فضلاء کی خدمات حاصل کی جائیں جو مذکورہ بالا علوم پر جدید کتابیں تالیف کریں۔ خصوصیت کے ساتھ اصول فقہ، احکام فقہ و اسلامی معاشیات، اسلام کے اصول عمران، اور حکمت قرآنیہ پر جدید کتابیں لکھنا نہایت ضروری ہے، کیونکہ قدیم کتابیں اب درس و تدریس کے لیے کارآمد نہیں ہیں۔ ارباب اجتہاد کے لیے تو بلاشبہ ان میں بہت اچھا مواد مل سکتا ہے

مگر ان کو جوں کا توں لے کر موجودہ زمانے کے طلبہ کو پڑھانا بالکل بے سود ہے۔

اس میں شک نہیں کہ سردست ان تینوں تدبیروں سے وہ مقصد بدرجہ کمال حاصل نہ ہوگا۔ جو ہمارے پیش نظر ہے۔ بلا شبہ اس تعمیر جدید میں بہت کچھ نقائص پائے جائیں گے لیکن اس سے ڈرنے کی کوئی وجہ نہیں۔ یہ صحیح راستہ پر پہلا قدم ہوگا۔ اس میں جو کوتاہیاں رہ جائیں گی ان کو بعد کی نسلیں پورا کریں گی یہاں تک کہ اس کے تکمیلی ثمرات کم از کم پچاس برس بعد ظاہر ہوں گے۔

(۴) اسلامی ریسرچ کا شعبہ قائم کرنے کا ابھی موقع نہیں۔ اس کی نوبت چند سال بعد آئے گی اس لیے اس کے متعلق تجاویز پیش کرنا قبل از وقت ہے۔

(۵) میری تجاویز میں فرقی اختلافات کی گنجایش بہت کم ہے تاہم اس باب میں علماء شیعہ سے استصواب کر لیا جائے کہ وہ کس حد تک اس طرز تعلیم میں شیعہ طلبا کو سنی طلبہ کے ساتھ رکھنا پسند کریں گے؟ اگر وہ چاہیں تو شیعہ طلبہ کے لیے خود کوئی اسکیم مرتب کریں، مگر مناسب ہوگا کہ جہاں تک ہو سکے تعلیم میں فروعی اختلافات کو کم سے کم جگہ دی جائے اور مختلف فرقوں کی آیندہ نسلوں کو اسلام کے مشترک اصول و مبادی کے تحت تربیت کیا جائے۔

(۶) سر محمد یعقوب کے اس خیال سے مجھے پورا اتفاق ہے کہ وقتاً فوقتاً علماء و فضلا کو اہم مسائل پر لکچر دینے کے لیے دعوت دی جاتی رہے میں تو چاہتا ہوں کہ علیگڈھ کو نہ صرف ہندوستان کا بلکہ تمام دنیائے اسلام کا دماغی مرکز بنا دیا جائے۔ آپ اکابر ہندوستان کے علاوہ مصر، شام، ایران، ترکی، اور یورپ کے مسلمان فضلاء کو بھی دعوت دیجیے کہ وہ یہاں آکر اپنے خیالات، تجربات اور نتائج تحقیق سے ہمارے طلبہ میں روشنی فکر اور روح حیات پیدا کریں۔ اس قسم کے خطبات کا نی معاوضہ دے کر لکھوائے جانے چاہئیں، تاکہ وہ کافی قیمتی

محنت اور غور و فکر کے ساتھ لکھے جائیں اور ان کی اشاعت نہ صرف یونیورسٹی کے طلبہ کے لیے بلکہ عام تعلیم یافتہ پبلک کے لیے بھی مفید ہو۔

(۷) اسلامی تعلیم کے لیے کسی ایک زبان کو مخصوص کرنا درست نہیں۔ اردو عربی، اور انگریزی تینوں زبانوں میں سے کسی ایک زبان میں بھی اس وقت نصاب کے لیے کافی سامان موجود نہیں ہے۔ لہٰذا سردست ان میں سے جس زبان میں بھی جو مفید چیز مل جائے اس کو اسی زبان میں پڑھانا چاہیے۔ دینیات اور علوم اسلامیہ کے معلمین سب کے سب ایسے ہونے چاہئیں جو انگریزی اور عربی دونوں زبانیں جانتے ہوں۔ علیگڈھ کے لیے کوئی ایک ر خا آدمی صحیح معلم دینیات نہیں ہو سکتا۔

میں اپنے بیان کی اس طوالت پر عذر خواہ ہوں۔ مگر اتنی تطویل و تفصیل میرے لیے ناگزیر تھی، کیونکہ میں بالکل ایک نئے راستہ کی طرف دعوت دے رہا ہوں جس کے نشانات کو پہچاننے میں خود مجھے غور و فکر کے کئی سال صرف کرنے پڑے ہیں۔ میں حتماً اس نتیجہ پر پہنچ چکا ہوں کہ مسلمانوں کے مستقل قومی وجود اور ان کی تہذیب کے زندہ رہنے کی اب کوئی صورت بجز اس کے نہیں ہے کہ ان کے طرز تعلیم و تربیت میں انقلاب پیدا کیا جائے اور وہ انقلاب ان خطوط پر ہو جو میں نے آپ کے سامنے پیش کیے ہیں۔ میں اس سے بے خبر نہیں ہوں کہ ایک بڑی جماعت ایسے لوگوں کی موجود ہے، اور خود علی گڈھ میں بھی ان کی کمی نہیں، جو میرے ان خیالات کو ایک دیوانے کا خواب کہیں گے۔ اگر ایسا ہو تو مجھے کوئی تعجب نہ ہوگا۔ پیچھے دیکھنے والوں نے آگے دیکھنے والوں کو اکثر دیوانہ ہی سمجھا ہے، اور ایسا سمجھنے میں وہ حق بجانب ہیں۔ لیکن جو کچھ میں آج دیکھ رہا ہوں چند سال بعد شائد میری زندگی ہی میں وہ اس کو بچشم سر دیکھینگے اور ان کو اس وقت اصلاح حال کی ضرورت محسوس ہوگی جب طوفان سر پر ہوگا اور تلافی مافات کے مواقع کم تر رہ جائیں گے۔

# مطبوعات

**عربی کا معلم** حصہ اول و دوم، از مولوی عبدالستار خاں صاحب، صدر مدرس مدرسۃ الاسلام منارہ مسجد، بمبئی، حجم ۸۷ + ۹۴ صفحات، قیمت عہ

لغت عرب کے قواعد کو مختصر اور سہل طریق پر بیان کرنے کی اب تک جتنی کوششیں کی گئی ہیں ان میں یہ کوشش کامیاب ترہے۔ مدارس عربیہ میں صرف و نحو کی جو کتابیں متداول ہیں وہ ملکۂ لسان کے مبادی میں ایسا رسوخ پیدا کرنے کی کوشش کرتی ہیں جو اکثر بے فائدہ ثابت ہوتا ہے۔ مہینوں گردانوں کے چکر میں سرگرداں رہنے اور زبان سے قطع نظر کرکے محض قواعد کی تحصیل میں مدتوں مشغول رہنے کے بعد بھی اکثر طالب العلم ادب سے بیگانہ ہی رہتے ہیں جملوں کی صرفی و نحوی تحلیل میں تو انھیں بڑی قدرت حاصل ہو جاتی ہے۔ مگر کلام عرب سے انھیں کوئی مناسبت پیدا نہیں ہوتی۔ اس طریقے کو متاخرین کی کتابوں نے رواج دیا اور صرف و نحو کے گوناگوں مسائل کا وہ انبار لگا یا کہ وسیلہ بجائے خود مقصود بن گیا۔ مولوی عبدالستار خاں صاحب نے اس نقص کا عمدگی سے مداوا کیا ہے۔ انہوں نے طلاب کو رٹانے سے زیادہ سمجھانے کی کوشش کی ہے، زبان کو مقصود قرار دے کر مبتدی کی ذہنی رفتار کے متناسب دل نشین اسلوب میں میزان سے کافیہ تک کے تمام ضروری مسائل بڑی خوبی سے سمو دئے ہیں، جس کی وجہ سے ایک ذہین مبتدی قلیل مدت میں بلا امداد معلم عربی زبان میں اچھی خاصی استعداد حاصل کر سکتا ہے۔

اس کتاب کا ایک خاص وصف یہ ہے کہ بکثرت امثلہ کلام اللہ سے اخذ کی گئی ہیں۔ جس سے نہ صرف اس طرز کی دوسری کتابیں بلکہ متاخرین کی بھی اکثر کتابیں یکسر معریٰ ہیں۔

پروفیسر عبدالقادر ایم اے کی اس رائے سے ہمیں پورا اتفاق ہے کہ بہ نسبت دیگر مروجہ کتب کے یہ کتاب اگر عربی مدارس کے ابتدائی نصاب میں داخل کی جائے تو زیادہ مفید ہوگی' ان دونوں حصوں کے ساتھ ایک ایک کلید بھی صاحب کتاب نے مرتب کی ہے' یہ کلید صرف ان لوگوں کے لیے ہے جو بطور خود عربی زبان سیکھنی چاہتے ہوں۔ ان دونوں کلیدوں کی قیمت تین آنے اور پانچ آنے ہے (ا-خ)

**عربی کا نیا قاعدہ** | حصۂ اول و دوم' از مولوی عبدالستار خاں صاحب' قیمت ۹ پائی اور ۶ پائی

فاضل مرتب نے یہ قاعدے حروف شناسی کی تسہیل کے لیے مرتب کئے ہیں اور عربی معلم کی طرح ان کے یہ دونوں قاعدے بھی تمام دوسرے قاعدوں سے بہتر ہیں جو آج کل بازاروں میں بکتے ہیں یہ دونوں قاعدے اعاطۂ بمبئی کے محکمۂ تعلیم نے ابتدائی مدارس کے نصاب میں داخل کرلیے ہیں۔ ہم سفارش کرتے ہیں کہ ناظرین ترجمان القرآن ان قاعدوں سے اپنے بچوں کی تعلیم کی بسم اللہ کریں (ا-خ)

**تقریر سیرت** | از مولنا احمد سعید صاحب ناظم جمعیت علماء ہند۔ ضخامت ۲۸ صفحات قیمت (۲؍ ملنے کا پتہ:- دینی بک ڈپو' کوچہ ناہر خاں۔ بیت السعید۔ دہلی۔

مولنا احمد سعید صاحب وعظ و بیان کے بادشاہ ہیں۔ دو برس ہوئے کہ سیرت نبوی پر انہوں نے ایک تقریر کی تھی جو بعد کو کتابی صورت میں شائع ہوی اور بہت مقبول ہوی۔ یہ اسی تقریر کی دوسری اشاعت ہے جسے مولنا کی نظر ثانی نے کچھ سے کچھ کردیا ہے۔ تقریر کیا ہے' خوش بیانی کا ایک دریا ہے جس کی موجوں پر سیرت پاک' قصص انبیاء و صالحین' لطائف قرآن و حدیث عقل و نقل اور سیاست ملی کے سفینے رواں ہیں۔ (ا-خ)۔

**ہمارے نبی کے صحابہ** | تالیف مولوی اعجاز الحق صاحب قدوسی۔ ضخامت ۱۲۰ صفحات۔ قیمت ۸ر۔ ملنے کا پتہ: دفتر ترجمان القرآن (حیدرآباد دکن)۔

قدوسی صاحب نے یہ کتاب بچوں کے لیے تالیف کی ہے اخلاق و عبادات اور معاشرت

کے جلی عنوانات کے تحت صحابہ کرام کی سیرت بیان کی ہے۔ زبان و بیان اور انتخاب احوال کا اسلوب بچوں کی فہم سے متناسب ہے۔ صحیح اسلامی تربیت کے لیے بچوں کو ایسی ہی کتابیں پڑھانی چاہئیں تاکہ شروع ہی سے ان کے دل و دماغ پر اسلامی سیرت کے نقوش مرتسم ہوں اور بزرگوں کے نقش و قدم پر چلنے کا جذبہ پیدا ہو۔ (ا ـ خ)

**قومی زبان** | تالیف مولٰنا یعقوب الرحمن صاحب عثمانی لکچرار عثمانیہ کالج (ورنگل) قیمت ۸؍ ملنے کا پتہ: دار التالیف دیوبند۔

اس مختصر رسالہ میں فاضل مؤلف نے ثابت کیا ہے کہ ہندوستان کے لئے اردو زبان ہی ایک مشترک قومی زبان ہو سکتی ہے۔ اس سلسلہ میں انہوں نے اردو زبان کی خصوصیات بڑی خوبی کے ساتھ بیان کی ہیں اور ان اعتراضات کو رد کیا ہے۔ جو اردو پر کیے جاتے ہیں آج کل اردو کے خلاف جو منظم جدوجہد ہو رہی ہے اس کو دیکھتے ہوئے یہ ضروری معلوم ہوتا ہے کہ اس زبان کے حامی اس قسم کے مضامین کو زیادہ سے زیادہ شائع کریں۔ صرف اردو ہی نہیں بلکہ ہندی اور انگریزی اور دوسرے صوبوں کی زبانوں میں بھی ان کی اشاعت ہونی چاہیے۔ (ا ـ م)

**اسلامی عملی زندگی کی درسی کتاب** | تالیف سید قاسم حسینی صاحب صفحات ۸۴ مجلد قیمت ۸؍ مکتبہ ابراہیمیہ حیدرآباد دکن

مولف کا مقصد یہ ہے کہ مسلمانوں کو اس قانونِ حیات کی علمی واقفیت اور عملی اتباع کی طرف توجہ دلائیں جو قرآن مجید اور سنت محمدی میں پیش کیا گیا ہے۔ مقصد نہایت مبارک ہے۔ اور مؤلف کی تحریر سے ان کی دردمندی کا بھی پتہ چلتا ہے لیکن خصوصیت کے ساتھ آج کل اسلام کی نمایندگی کے لیے محض دردمندی کافی نہیں بلکہ اس کے ساتھ پختہ کاری، وسعت نظر، اور حکیمانہ اسلوب بیان کی بھی ضرورت ہے۔ اس کتاب میں ان تینوں چیزوں کی کمی پائی جاتی ہے۔ زبان ناقص ہے املا تک درست نہیں جگہ جگہ غیر ضروری مباحث سے بیان میں الجھاؤ پیدا کر دیا گیا ہے۔ اور

علم دین میں بھی مؤلف کی واقفیت محدود معلوم ہوتی ہے۔ خیالات پاکیزہ اور مقاصد بہت عمدہ ہیں مگر لکھنے والوں کو قلم اٹھانے سے پہلے اپنی قوت کا صحیح اندازہ کرلینا چاہیے۔ (ا۔م)

**نور النور** تالیف جناب غوثی شاہ صاحب چنچلگوڑہ۔ حیدرآباد دکن۔ ضخامت ۹۶ صفحات قیمت درج نہیں۔ جناب مؤلف سے طلب کی جاسکتی ہیں۔

اس کتاب میں فاضل مؤلف نے کتاب وسنت سے مسئلہ وحدۃ الوجود کی حقیقت سمجھانے کی کوشش فرمائی ہے۔ اہل علم جانتے ہیں کہ یہ بحث کس قدر پیچیدہ اور نازک ہے معمولی عقل و فہم کے آدمی تو درکنار، بڑے بڑے ذکی اور صاحب نظر لوگ بھی اس راہ میں ٹھوکر کھا جاتے ہیں۔ اسی لیے اکابر صوفیہ نے عوام کے سامنے اس مسئلے کو پیش کرنے کی ممانعت فرمائی ہے، اور خواص کے سامنے بھی اس وقت تک بیان نہیں کیا ہے جب تک کہ وہ تزکیۂ نفس اور تربیت روحانی کے ساتھ معرفت حق کے ابتدائی مدارج سے نہ گذر جائیں۔ پس ہماری رائے میں یہ مناسب ہی نہ تھا کہ شاہ صاحب ممدوح اس کتاب کو شائع فرماتے۔ جہاں تک بیان کا تعلق ہے انہوں نے اپنی طرف سے توضیح کی کوشش میں دقیقہ نہیں اٹھا رکھا۔ مگر جو مقامات ہمیشہ سے مزال اقدام رہے ہیں وہ اس تبیین و توضیح کے بعد بھی ویسے ہی ہیں۔ دراصل ان مسائل کا تعلق بیان کرنے والے کی قوت بیان سے زیادہ سمجھنے والے کی قوت فہم و ادراک سے ہے، اور یہ چیز ہر کس و ناکس کو میسر نہیں۔ (ا۔م)

**تاریخ دکن** تالیف جناب ہارون خانصاحب شیروانی استاذ تاریخ وسیاسیات جامعہ عثمانیہ ضخامت ۱۷۲ صفحات۔ قیمت مجلد ۱۲ - غیر مجلد ۱۴

فاضل مؤلف نے یہ کتاب ابتدائی جماعتوں کے طلبہ کے لیے لکھی ہے۔ مگر عام ناظرین بھی اس کے ذریعہ سے تاریخ دکن کی ضروری معلومات حاصل کرسکتے ہیں۔ بیان نہایت صاف اور سلیس ہے واقعات مستند ہیں۔ تاریخ نگاری کا جدید اسلوب اختیار کیا گیا ہے جس سے پڑھنے والوں کی نظر واقعات

کے باطن تک بھی پہنچ سکتی ہے، اور وہ تغیرات احوال میں تمدن و تہذیب کے ارتقاء کو بھی دیکھ سکتے ہیں۔ مزید براں اس کتاب میں اُن نقائص کی اصلاح پر بھی کافی توجہ کی گئی ہے جو ہندوستان کی تاریخ نگاری میں غیر قومی نقطۂ نظر کے غالب ہوجانے کی وجہ سے پیدا ہو گئے ہیں۔ (ا-م)۔

**الزہرات** | جناب عبدالرحمٰن کاشغری صاحب استاذ دارالعلوم ندوہ کے عربی کلام کا مجموعہ ہے شاعر ترکی الاصل ہے اور ہندوستان میں اس نے عربی کی تعلیم پائی ہے، مگر کلام میں عربیت کی شان پائی جاتی ہے، ہندوستان میں عربی ادب کے مذاق کو زندہ کرنے کے لیے جو کوششیں کی جارہی ہیں ان میں اہل ندوہ پیش پیش ہیں اور ان کی خدمات قدر کے قابل ہیں۔ امید ہے کہ عربیت کا ذوق رکھنے والے حضرات اس مجموعۂ کلام سے لطف اندوز ہوں گے قیمت ۸ر۔ ملنے کا پتہ مکتبۃ الضیاء لکھنؤ۔

**اسباب زوال امت** | امیر شکیب ارسلان کے ایک مضمون کا ترجمہ ہے جسے سیرت کمیٹی (پٹی) نے شائع کیا ہے۔ امیر موصوف دنیائے اسلام کے لیڈروں میں ایک نمایاں شخصیت رکھتے ہیں۔ مسلمانانِ عالم کے حالات پر انکی نظر بہت گہری اور وسیع ہے۔ انہوں نے مسلمانوں کی موجودہ پستی کے اہم ترین اسباب کو بڑی خوبی کے ساتھ بیان کیا ہے۔ اور نہایت عبرت انگیز واقعات سے مثالیں دیکر مسلمانوں کو سمجھانے کی کوشش کی ہے کہ وہ کونسی اخلاقی اور ایمانی کمزوریاں ہیں جو ان کے زوال کی باعث ہوئیں اور اب تک ہو رہی ہیں۔ مسلمانوں میں اس رسالہ کی عام اشاعت ہونی چاہیے قیمت فی نسخہ آٹھ نسخوں کے لیے ایک روپیہ۔ سو نسخوں کے لیے دس روپیہ۔

**جدید خطبات جمعہ** | از جناب "خطیب رازی" شائع کردہ سیرت کمیٹی، پٹی (ضلع لاہور)۔ یہ خطبے اردو زبان میں لکھے گئے ہیں۔ ہر خطبہ کی ابتدا عربی میں حمد و صلوٰۃ اور چند آیات قرآنی سے کی گئی ہے اور اس کے بعد نہایت عام فہم اردو میں مسلمانوں کے موجودہ حالات و

ضروریات کو پیش نظر رکھ کر مفید خیالات کا اظہار کیا گیا ہے۔ سیرت کمیٹی کوشش کر رہی ہے کہ ہندوستان کی مساجد میں یہ خطبات رائج ہوں اور اس کے لیے یہ انتظام کیا گیا ہے کہ جن مساجد کے ائمہ ان خطبات کو پڑھنا چاہیں وہ اپنے پتے کمیٹی میں درج کرا دیں وہاں سے ہر جمعہ کا خطبہ ان کو بھیجدیا جائے گا۔ اور سال کے ۵۲ خطبات کے لیے صرف ۸ روپے پڑیں گے۔ بحالات موجودہ جبکہ ہماری قوم میں اصلی خطیب (یعنی برجستہ تقریر کرنے والے) موجود نہیں ہیں، اور لکھے ہوئے خطبے پڑھنا قریب قریب ناگزیر ہو گیا ہے، کم از کم یہی اصلاح بہت غنیمت ہو گی کہ رسمی خطبوں کے بجائے ان مفید خطبوں کو رائج کیا جائے، کیونکہ خطبۂ جمعہ سے جو کچھ مقصود ہے وہ کسی نہ کسی حد تک اس طریقہ سے حاصل کیا جا سکتا ہے۔

خطبۂ جمعہ کی زبان کے بارے میں اہل فقہ کے درمیان بہت کچھ اختلافات پائے جاتے ہیں۔ ایک جماعت عربی خطبہ کے وجوب کی قائل ہے۔ دوسری جماعت غیر عربی خطبہ کو جائز قرار دیتی ہے، مگر اس کے ساتھ ہی اس کی کراہیت کی بھی قائل ہے۔ تیسری جماعت جواز بلا کراہت کا حکم لگاتی ہے۔ یہاں تفصیلی بحث کا موقع نہیں۔ انشاء اللہ کسی دوسرے موقع پر ہم اس مسئلہ کی تحقیق کریں گے، سر دست صرف اتنا اظہار کافی ہے کہ غیر عربی خطبہ کی کراہت کے لیے کوئی دلیل ہم کو کتاب و سنت میں نہیں ملی۔ زبان خطبہ کا مسئلہ تمام تر قیاسی اور استنباطی ہے اور جتنے دلائل عربی خطبہ کے لزوم پر قائم کیے جاتے ہیں ان سے بہت زیادہ قوی دلائل اس امر کی تائید میں موجود ہیں کہ خطبہ کی زبان وہی ہو جس کو مخاطبین اچھی طرح سمجھ سکیں۔ (ا۔ م)

# مکتبہ علمیہ

سلطنت آصفیہ میں یہ ایک ایسا مکمل تجارتی کتب خانہ ہے جو خاموشی کے ساتھ اردو زبان کی خدمت انجام دے رہا ہے اور جہاں سے ہر مذاق اور ہر علم و فن کی اردو عربی فارسی اور انگریزی کتب اور ان کے تراجم مل سکتے ہیں طلبا کے لیے درسی کتب کا بھی انتظام کیا گیا ہے بیرونی مقامات کے لوگوں کو بھی حسب فرمائش کتابیں بھیجی جا سکتی ہیں جو مصنفین و مولفین حیدرآباد میں اپنی تصانیف کی اشاعت اور ان کی فروخت کا معقول انتظام چاہتے ہوں وہ مہتمم مکتبہ سے ذریعہ خط و کتابت جملہ امور کا تصفیہ فرما سکتے ہیں حیدرآباد کے مشہور اور نامور شعراء اور مصنفین کی تصانیف آپ کو مکتبہ ہی سے مل سکتی ہیں آج ہی ایک کارڈ لکھ کر

فہرست مفت **مالک خواجہ بہاو الدین صاحب مکتبہ علمیہ چار مینار حیدرآباد دکن** طلب فرمائیے۔

---

# قواعد

رسالہ ترجمان القرآن بالعموم ہر ہجری مہینے کی ۱۰ تاریخ کو شائع ہوا کرے گا مہینہ کے آخر تک جن حضرات کے پاس پرچہ نہ پہنچے وہ دوبارہ لکھ کر منگوا سکتے ہیں ختم ماہ کے بعد دوسرے مہینے کی ابتدا میں جن خریداروں کی شکایات موصول ہوں گی ان کو پرچہ قیمتاً دیا جائے گا

جو حضرات اپنی جائے قیام طویل مدت کے لیے تبدیل کریں انہیں اپنے جدید پتے کی اطلاع دفتر کو بھیج دینی چاہیے ورنہ پرچہ نہ پہنچنے کی ذمہ داری دفتر پر نہ ہوگی۔

خریداروں کو دفتر سے مراسلت کرنے میں ہمیشہ نمبر خریداری کا حوالہ ضرور دینا چاہیے لیکن یہ لحاظ رہے کہ رجسٹر نمبر اور چیز ہے اور نمبر خریداری اور چیز

اشاعت کے لیے مضامین و حل طلب مسائل تمام ایڈیٹر کے نام بھیجے جائیں لیکن ایڈیٹر پر لازم نہیں کہ ہر چیز شائع کرے

**منیجر ترجمان القرآن بدرالدین بلڈنگ نظام شاہی روڈ حیدرآباد دکن**

(طابع و ناشر سید ابوالاعلیٰ مودودی)

(مطبوعہ اعظم سٹیم پریس چار مینار حیدرآباد دکن)

اُردو زبان کی ایک پرشکوہ کتاب

# تمدنِ عرب

جو مدتوں سے نایاب تھی پہلے ایڈیشن ۱۸۹۸ء

کی ۶۰۰ صفحہ ضخامت مع خصوصیات کے ساتھ طبع ہو رہی ہے (۱۴۵) امریکن بلاک (۱۵۱) صفحے اعلیٰ کاغذ

نفیس چھپائی، بہترین سنہری جلد فرانس کے مایہ ناز مؤرخ ڈاکٹر گستاؤلی بان کی اصل کتاب کا ترجمہ

## مولوی سید علی بلگرامی مرحوم کا بے مثل علمی کارنامہ

جس کی پچاس روپیہ قیمت تھی مگر اب ایک سو روپیہ میں بھی نہیں مل سکتی تھی

## اعلیٰحضرت فرمانروائے دکن (مد ظلہ) کے

جشن سیمین کی شادمانی میں غرۂ ذی حجہ سنہ ۱۳۵۵ھ تک شائع ہو جائے گی

## پیشگی رعایتی قیمت بیس روپے بعد طبع پچیس روپے

جامعہ عثمانیہ کی جملہ مطبوعات ہر قسم کی نادرۂ روزگار کتابوں کے لیے

## سید عبد القادر

پبلشر گورنمنٹ ایجوکیشنل پبلشر و پروپرائٹر اعظم اسٹیم پریس چار مینار حیدرآباد دکن کا (پتہ یاد رکھیں)